

سابقہ لاکھ بھرتی	وہی سرسید جی کے دوست کو کہو
ایک دفعہ ایک دن	کوئی عبادت گاہ سے ہوا کہ درخورد
ایک دوسرا بھی بچہ اس کے مر گیا	
انہوں نے کوئی ہر ایک اس کے مر گیا	
خاتون کو کہیں بل کر کہا	مشتوقی کا نام آئی کسی کے نہ تھا نصی
اور سید اہل کی وہ زنانہ کو کہہ کر ملن گئی	مشتوقی نے اپنے عشق پر زبانی
اور بھی اپنے من کو چھٹا کے مر گیا	
زندہ رہا نہ کوئی ہر ایک اس کے مر گیا	
میرزا میر شاہ و گدا میرا اور وزیر	سب ان کو بل کے ہوئے و ام میں اسیر
مفتاحی ریا صاحب تاج و علم سیر	کون اس جہان میں جندہ اور میان ظہیر
اول ہر آدمی اس کی ہر ایک اس کے مر گیا	
زندہ رہا نہ کوئی ہر ایک اس کے مر گیا	

سوانح عمری ملا پوٹا

سوانح عمری نہایت عمدہ قابل دید۔ ابراہیم ملا دوبازہ کے ابتدائی حالات۔ اسے سعید پور کا سامنا۔ آخر خواجہ حسن متہ حال ہو کر دربار اکبری تک پہنچا۔ پھر پانچواں زندہ زندگی چین سے بسر کرنا۔ شہنشاہ اکبر کے لاکھ بھرتی سے بغیثت ۲۰ طلب کر دینا۔

شیخ گلزار محمد احمد علی تاجران کتب لاہور بازار کشمیر

نہیں کہ کتاب صورت سے دہ غارتگر ہے
جی صورت ہے مری ویسی ہی تصویر ہے

آمر و جان

ایک طوائف کی سوانح عمری اوسی کی زبانی۔
جمین لکھنؤ کے طرز معاشرت کی ہو ہو تصویریں سچے
واقعات اور اصلی مقامات کے بعینہ نقشے ہر شخص اور
ہر حالت کے مناسب بول چال۔ اعلیٰ درجہ کا تھراؤ
مؤلف
عالیجناب مرزا زحوا صاحب باسمنہ و القابہ لکھنؤ

مطبوعہ دار احادیثی کتب سنگھ اینڈ سنز پریس لکھنؤ

نہیں کہ کتاب صورت سے دہ غارتگر ہے

جی صورت ہے مری ویسی ہی تصویر ہے

ہم کو بھی کیا کیا مزے کی داستانیں یاد ہیں لیکن اب ہمیں ذکر درد و ماتم ہو گئیں

بطین ا۔ شان نزول اس قصے کی ہے کہ وہاں بارہ برس کا ذکر ہے۔ یہ ایک دوست
منشی احمد حسن صاحب اطراف دہلی کے رہنے والے بطین بسو دیانت لکھنؤ میں تشریف
لے گئے تھے۔ اوغون نے جوگ میں سید حسین کے بھانجے کے پاس ایک کمرہ کرائے کو لیا تھا۔
بیان کثیر اجاب سرشام آجیتے تھے۔ بہت سی لطائف کی صحبت ہوئی تھی۔ منشی صاحب کا
خداوند شریفی اعلیٰ درجے کا تھا۔ خود بھی کبھی کبھی لکھتے تھے اور اچھا کہتے تھے۔ لیکن زیادہ
اور انکو سننے کا شوق تھا۔ ایسے اکثر شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ اسی کمرے کے برابر ایک اور
کمرہ تھا اوسمین ایک طوائف رہتی تھی۔ بود و باش کا طریقہ اور زینتوں سے بالکل علیحدہ
کبھی کسی نے ہر راہ کمرے پر نہ دیکھا نہ وہاں کسی کی آمد نہ تھی۔ دروازوں میں دروازے
پر دے پڑے رہتے تھے۔ جوگ کی طرف نکاس کا دروازہ بالکل مغل رہتا تھا۔ گلی کی جانب
ایک اور دروازہ تھا۔ اوسے سے نوکر چاکر آنے جاتے تھے۔ اگر کبھی بھی رات کو کھانے کی آواز
آتی تو یہ بھی معلوم ہونا کہ اس کمرے میں کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں۔ جس کمرے میں
ہم دو گون کی نشست تھی اوسمین ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ سیکڑا اوسمین کرا پڑا ہوا تھا۔
لیکن حسب معمول اجاب کا جلدہ تھا۔ کوئی غزل پڑھ رہا تھا۔ اجاب داد دے رہے
تھے۔ اتنے میں میں نے ایک شعر پڑھا۔ اس کھڑکی کی طرف سے واہ وا کی آواز آئی۔
میں چپ ہو گیا۔ اور اجاب بھی اوس طرف توجہ ہو گئے۔ منشی احمد حسن صاحب نے پکار کے کہا
خانا نہ خریف ٹھیک نہیں۔ اگر خون شعر و سخن سے جلدہ میں تشریف لائے۔ اسکا کوئی حوالہ
نہ ملے۔ میں پھر غزل پڑھنے لگا۔ بات رفت و گذشت ہوئی۔ غویزی دیر کے بعد ایک ہری
آئی اوسنے پہلے سب کو سلام کیا۔ پھر یہ کہا۔ مرزا اسرا کوں صاحب ہیں۔ اجاب نے مجھے
بتا دیا۔ ہری نے کہا۔ بوی نے ذرا آپ کو بٹایا ہے۔ میں نے کہا۔ کون بوی۔ ہری نے
کہا۔ بوی نے کہہ دیا ہے۔ نام نہ بتانا۔ آگے جو آپ کا حکم ہو۔ مجھے ہری کے ساتھ جاتے
میں نال ہوا۔ اجاب مجھے مذاق کرنے لگے۔ ہاں صاحب جانے کون نہیں کبھی کی صاحب
ہے۔ جب فوراً طرح بٹا بھیجا۔ دل میں غور کر رہا تھا کہ کون صاحب ایسی بے کلفت ہیں۔
جتنے میں ابھر ہری نے کہا۔ حضور بوی آپ کو ابھی طرح بانجی ہیں۔ جب نو بٹا بھیجا ہے۔



رسوا۔ عات فرمائیے۔ یہ در کسر مجھے ہوگا۔
 منشی صاحب۔ اچھا تو وہ مطلع کیا تھا۔ امراؤ۔ میں عرض کیے دینی ہوں۔
 کچھ میں جا کے بھول گیا راہ دور کی
 ابان بچ گیا ہے مولائے شیر کی
 منشی صاحب۔ خوب کہا ہے۔ خانصاحب۔ اچھا مطلع کہا ہے۔ مگر یہ بھول گیا، کیا کرنا؟
 امراؤ جان۔ تو کیا خانصاحب میں بخنی کہتی ہوں!۔
 خانصاحب۔ خزاں بخنی کا ہے۔ "مرے مولائے شیر کی" آپ ہی کی زبان سے چھٹا
 معلوم ہوتا ہے۔
 رسوا۔ بس آپ کے تجلے شروع ہو گئے۔ رے شعر سنئے دیجئے۔ خانصاحب دنیا میں اگر ب
 آپ ہی کے سے محقق ہو جائیں تو شعر گوئی کا فرانشرفت لجاے۔ ۴ ہر گلے راز نگہ بوی دیکر
 خانصاحب۔ (کسی قدر زبردست ہو رہی ہے) درست۔
 رسوا۔ امراؤ جان اچھا۔ تو کوئی اور سنل پڑھو۔
 امراؤ۔ دیکھئے کچھ یاد آئے تو عرض کروں۔ ٹھوڑی دیر کے بعد
 شب فرقت بسر نہیں ہوتی نہیں ہوتی محسوس نہیں ہوتی!۔
 حضار علیہ۔ واہ۔ اسجان اٹھ۔ کیا کہنا۔
 امراؤ۔ تسلیم کر کے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔
 شور فہر بادنا خاک بھونچا سکر اوسکو خبر نہیں ہوتی!۔
 رسوا۔ کیا شعر کہا ہے۔ (حضار نے بھی قریف کی)
 امراؤ۔ آپ کی عنایت۔ تسلیم۔ تسلیم۔
 تیرے کو چے کے بنواؤں کو آہوس مال در نہیں ہوتی!۔
 اجاب قریف۔ امراؤ۔ تسلیم۔ زندگی یوں بسر نہیں ہوتی
 جان دینا کسی پر لازم تھا۔
 رسوا۔ واہ! خانصاحب یہ شعر ملاحظہ ہو۔ خانصاحب۔ سجان ارشد حقیقت میں کیا
 امراؤ۔ تسلیم۔ آپ صاحب قدر افزائی فرماتے ہیں۔ ۶۔ در نہن کیا میری حقیقت
 ہے نہیں وہ نہ آئیں گے پھر بھی کب تک ہوسے در نہیں ہوتی
 خانصاحب۔ یہ بھی خوب کہا۔ پنڈت صاحب۔ کیا طرز کلام ہے
 امراؤ۔ تسلیم کر کے۔

اب کس امید نظر میری شکوہ کسچ اثر نہیں ہوتی!۔
 خانصاحب۔ کیا اچھا کہا ہے۔ فارشتہ ٹپک رہی ہے۔
 منشی صاحب۔ جو کچھ ہر مضمون اچھا ہے۔ امراؤ۔ تسلیم۔
 ہم اسبران عشق کو صیاد ہوس مال در نہیں ہوتی۔
 اجاب۔ قریف۔ امراؤ۔ تسلیم۔
 غلط انداز ہی سہی وہ نظر کون مرے حال پر نہیں ہوتی
 خانصاحب۔ مان ہونا تو چاہئے۔ خوب کہا ہے۔ امراؤ۔ تسلیم۔ ملاحظہ ہو۔
 اسے آدا اس کسم بھی نہ مانیں گے دل کو دل کی خبر نہیں ہوتی
 خانصاحب۔ کیا مطلع کہا ہے۔ یہ آپ اپنا تجربہ بیان کرتی ہیں۔ اور لوگوں کی رائے
 اسکے خلاف ہے۔
 امراؤ۔ ذاتی تجربہ جو کچھ ہو۔ میں نے تو اک شاعرانہ مضمون کہا ہے۔
 رسوا۔ اچھا ذرا بھر تو پڑھیے۔ امراؤ جان نے بھر پڑھا۔
 رسوا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے دونوں پہلو اس شعر کے کل کچھ ہیں
 خانصاحب۔ دانی در صاحب کیا خوب بات کہی۔
 اجاب۔ غزل از مطلع تا مطلع ایک رنگ میں ہے۔ اسے درجے کا مذاق ہے۔
 آغا صاحب۔ نشست الفاظ تو ملاحظہ کیجئے۔
 پنڈت صاحب۔ کیا در فضا کی ہے۔
 امراؤ جان۔ (کھڑی ہو کر) تسلیم۔
 منشی صاحب۔ خانصاحب اب کب کچھ ارشاد کیجئے۔
 خانصاحب۔ حضرت مجھے نومان کیجئے کچھ یاد ہی نہیں آتا۔
 رسوا۔ کچھ تو پڑھیے۔
 خانصاحب نے ایک مطلع اور دو شعر پڑھے۔
 خانصاحب۔ جو بہت اہم نہیں ملتی ماہ میں ایک شب نہیں ملتی!۔
 رسوا۔ کیا اچھا کہا ہے۔ مجھے شب چاروہم۔
 خانصاحب۔ تسلیم۔
 یوں تو ملتی ہے داد صفت شعر داو حسن طلب نہیں ملتی!۔
 رسوا۔ کیا کہنا۔ خوب فرمایا۔

خانصاحب - شوخیوں سے کسی کی میری مراد
ہلے ملتی تھی اب نہیں ملتی

رسوا - لاجواب شعر کہا ہے - خانصاحب - تسلیم

ایکے بعد ایک صاحب تشریف لائے آدمی کے ہاتھ میں لالٹین تھی

خانصاحب - یہ کون صاحب آئے ہیں - شب باہن لالٹین کی کیا ضرورت تھی

نوابصاحب - حضرت حماقت تو ہوئی - معاف کیجئے گا

خانصاحب - آؤ - نوابصاحب - بھنور رضا لفظ نادر

نوابصاحب تشریف لائے - نیلے قینلم کی غزل پڑھنے کی فرمائش ہوئی

نوابصاحب - میں تو آپ صاحبوں کا مشتاق ہوں کہ آپا ہوں - مجھے تو کچھ یاد آوا نہیں

شیخصاحب - جناب غزل پڑھنا ہوگی

نوابصاحب - آجھا جو کچھ یاد آتا ہے - عرض کیے دیتا ہوں

دل میں کتب جا بگی فائل کی اور ایک نہ ایک

کا ذکر ہوگا کبھی شبیر نضا ایک نہ ایک

اجاب - بجان اللہ - واہ - کیا مطلع فرمایا ہے

نوابصاحب - (تھک جھکا کے قینلم کرتے گئے) شعر ملاحظہ ہو

کوئی عورتوں پر ہند اکوئی خون پر شیدا

دھندہ ہی لینے ہیں انسان خدا الیکٹ ایک

اجاب - واہ کیا شعر کہا ہے - نوابصاحب - تسلیم - اسکے بعد چپ ہو رہے

رسوا - اور کچھ ارشاد ہو - نوابصاحب - واہ اب کچھ باقی نہیں آتا

منشی صاحب - ہند صاحب اب آپ داد فصاحت دیجئے

ہندت جی - ایشالا لام - دین شعر عرض کیے دیتا ہوں

وصل میں ذکر عہد بھی دم بدم ہونا رہا

شہر بیت دیدار میرے حق میں غم ہونا رہا

اجاب - قربت - ہندت صاحب

زاد آؤ دون سے چرچا حق پرستی کا ہوا

دھندہ کیے میں سدا ذکر صنم ہونا رہا

نواب - ہم نہیں کہہ سکتے - مگر خوب کہا

ہندت صاحب - کیجئے یا نہ کیجئے - مگر بات یہی ہے - یہ شعر ملاحظہ ہو

واظنا کون سر جھکائے دکھی کے درود جھکا کر نقش قدم پر اوکے غم ہونا رہا

اجاب - تقریب - ہندت صاحب

زلف کی قربت بن دفر کے دفر لکھئے - مرہو حال پریشانی رسنم ہونا رہا

رسوا - یہ خاص لکھنؤ کا مذاق ہے

ہندت جی - اور آپ مدلی کے کب ہیں

رسوا - آجھا شعر پڑھیے - میں نے نوارک بات کہی

ہندت جی - دل جو تھا پہلے گل نور سے بارغ مراد

خار خار حسرت - بیخ و امل ہوتا رہا

نوابصاحب - دیکھئے کیا شعر کہا ہے - خانصاحب - نہانت الفاظ ملاحظہ ہو

ہندت جی - تسلیم - مطلق ملاحظہ ہو

شکر یہ مجبور اوکے گلاب ادا بنجے ہوا

ہر نفس تجھ جو خالی کا کرم ہوتا رہا

خانصاحب - بجان اللہ ہر نفس کہ فردوس دو مہمات است و چون بری کہ

مفرح ذات

رسوا - خانصاحب آج کے اسے تو شعر ہی پڑھنا شکل ہے

اجاب - بجان اللہ کیا غزل فرمائی ہے - ہندت جی - آپ کی عنایت - پرورش

بندہ نوازی - واہ - یہ آپ ہی لوگوں کا صدقہ ہے

منشی صاحب - شیخصاحب - آپ تو کچھ ارشاد دیجئے

شیخصاحب - (مسکرا کے) جی مجھے تو کچھ یاد آوا نہیں

خانصاحب - یاد نہیں - مگر شعر کی غزل حبیب میں ہو

شیخصاحب - واہ نہیں - صرف جا شعر الہی موزون کر لے ہیں

رسوا - تو پھر پڑھتے کون ہیں - شیخصاحب - پھر عرض کیے دیتا ہوں

عرض دہ عرض کہ جس عرض بن اصرار نہ ہو

بات وہ بات کہ جس بات سے اکا رہو

اجاب - قربت - شیخصاحب - تسلیم

اُن کے دل ان کب یہ نشہ تہیں
اُن سے واہد آپ آچھے ہیں
کہیں بڑھکر سے آپ کا انداز
آپ قدرت نامے منی ہیں
آپ کے آگے کو ن نہ کھولے
سے یہ انداز آپ کا حصہ
دل میں ہم خوب کر پلے ہیں غور
آپ ایسے ہیں آپ ویسے ہیں
آپ کیا قدر اپنی پہچانیں
آپ کا کام ہے ہر اسندی
ایسے شاعر ہوئے تھے کب پیدا
الغرض ہے نئی اڈراتے ہیں
انکی قرین ہے وہ لا طائل
نہ سے وہ شعر اور دھڑکاتے ہیں
جنکی قرین کا یہ تھا مذکور
اگر اس میں کسی کو غصہ آئے
ہیں یہ بات کچھ تعجب کی
رہے ہیں لفظ لفظ رک رک کے
گو بظاہر ہے ابھار بہت
کس قدر تھے ہیں بر رتے ہیں
ہوئی ہے لفظ لفظ کی تشبیہ
کہوں ہوں اپنی مدح کے شائق
کس قدر دور ہیں مصادرا
نکتہ فہم ایسے محنت دان ایسے
مہوئی قرین کی حقیقت کیا
اس میں کیا خط ہے یہ فرا کیا ہے
گو کہ مہر ہی مذمتیں ہونگی

مات گوئی کی مراد پاؤں کا
کیا غرض ہے جو میں کسی سے اڑا
نچو بھاتی نہیں لگی لپٹی
طرز اہل سخن سے ناخوش ہوں
شاعری ہے اگر اسی کا نام
اس نظم کی انصاف پسند احباب نے بڑی قرینت کی۔
رہا۔ ہر شعر پر اہل عقل قرین کر رہے تھے۔ منشی صاحب پروردگار کا عالم طاری
تھا۔ امرا و جان جہوں رہی تھیں۔ اور میراجو حال تھا وہ میرے ہی دل سے کوئی
ہو چھے۔
منشی صاحب۔ ہاں جناب آغا صاحب اب آپ کچھ عنایت فرمائیے۔
آغا صاحب۔ بہت خوب۔ مطلع اول ملاحظہ ہو۔
کہیں سامان ایسے ہوں تو کچھ دل کو مرے کل ہو
مڑاویں ہوئے ہوں اور ایک مڑے کی بول ہو
احباب۔ واہ آغا صاحب کیا مطلع فرمایا ہے۔
آغا صاحب۔ ادحضت ایسی آجے سنائی کیا ہے دوسرا مطلع سنئے۔
وہ مضمون دھونڈ کر یا نہ دھونڈ کر جو کھل سے کھل ہو
کہوں وہ مطلع فانی کہ جو اول سے اول ہو
احباب۔ بیشک اول سے اول ہے۔
آغا صاحب۔ اے اب شعر ملاحظہ ہوں۔
بکھٹ بر طرف صاحب اگر ایسے ہی نازک ہو
ہیں تو نور کے کپڑے نہ جالی ہو نہ ملمس ہو
اس شعر کا رخ نوا ب صاحب کی طرف تھا۔ جو جالی کا کرتہ ہلکا بادامی دگا اور باریک
لمل کا آنکر کہہ رہے۔ بند کھولے ہوئے نیٹھے تھے۔ اور ایک نہایت ہی نفیس رنگیابا ہد
میں تھی اسے بھٹلے جاتے تھے۔
اگر جاڑے میں تول جاتے تو کیا غم ہے جاڑے کا
تری زلفین ہوں شائے پروردگار ہوئے گل ہو
احباب۔ قرینت۔

آغا صاحب۔ کہو بیچارگی میں بھی طبیعت خوش رکھے جنوں نے
 کہ چلے تانہ لیلی ہری جب دل کی کوہل میں
 پنڈت جی۔ سبحان اللہ! اور نادر۔ یہ بیچارگی سے چارہ کیا نکالا ہے۔
 آغا صاحب۔ رائے سمجھے بھی خوب۔ سمجھو۔ تو ایسی برہنہ ہیں تو نہ ہو۔
 آغا صاحب۔ ہوں۔ اچھا۔ اب یہ غور کیجئے۔
 کہو عثمان سے اپنے کہ ضبط کر یہ نہ رہا میں
 دیکھے گا راستہ گھر کا اگر کوہے میں لہلہ ہو
 شیخ صاحب۔ اچھی کہی۔
 رسوا۔ (آغا صاحب سے) آپ کیون سکوت میں ہیں۔ کوئی اعتراض نکالے۔
 آغا صاحب۔ ان جناب سکوت۔ قدر شناس ٹھیک نہیں ہے۔
 آغا صاحب۔ آپ میری تقریر کو تحقیر نا شناس نہ سمجھئے۔ ایسے چپ ہوں۔
 آغا صاحب۔ نہیں حضرت میری ایسی ادنیٰ سمجھ نہیں ہے۔
 آغا صاحب۔ اس فقرے پر نوٹ لگئے۔ آغا صاحب۔ شعر ملاحظہ ہو۔
 ہمیں رنگ آئے اپنے سے ہمیں سے غریب ہوا
 ہم ایسے دو نظر آئیں اگر مشنوں آجول ہو
 آغا صاحب۔ آغا صاحب۔ سبحان اللہ۔ کیا ناز گنیا لی کی ہے۔
 آغا صاحب۔ اچھی کم سن ہیں اور کم سنوں سے نگرانے کا
 ٹھکانا ڈھلکا ہوا ایک نہ نکلتا نہ نکل ہو
 اس شعر کا رخ بھی آغا صاحب کی جانب تھا۔ ایسے کہ آپ ہی کی سرکار عالیجاہ سے
 سکوت کی برائے بڑی دھوم سے نکلی تھی۔
 آغا صاحب۔ کوئی آواز نہ تھی کہ جو شعر معنی بند کہتے ہیں
 کہلے کیا راز سربستہ جو دروازہ مفتعل ہو
 رسوا۔ آغا صاحب کیا کہنا! امراؤ جان۔ ذرا سنا۔ کیا شعر کہا ہے۔
 امراؤ جان۔ سبحان اللہ۔ میں پہلے ہی سمجھ گئی۔ جو چاہیں کہہ میں۔ مالک ہیں
 آغا صاحب۔ زمانہ صاف کیون نہیں کہتے کہ دوزخ کا دربان ہوں۔ اچھا
 کسی صورت سے پہلا لیں گے اور مشنوں کم سن کو
 ڈبل پیسا نہ ہو ریڑی نہ ہو تو گول گول ہو

آغا صاحب۔ کیا کہنا۔
 آغا صاحب۔ کبھی گالی سننا بیٹھے کبھی جوتا لگا بیٹھے
 حکومت کا فرمائے اگر مشنوں ازل میں
 آغا صاحب۔ درست۔ مگر آپ کی شرافت سے مراد ہے۔
 آغا صاحب۔ جناب شریف کون سے اس زمانے میں۔
 خدا کے فضل سے اور اتنا کیا ہی عرش سے جوڑا
 نہ بچا کوئی گرگا ہونہ تم ہی کو کی شغفل ہو
 آغا صاحب۔ خوب۔ مگر وہ نہیں کہیں کی طرف سے
 آغا صاحب۔ یہ تو آپ ہی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ ایسے کہ آپ محرم راز ہیں۔
 "الشرعند کرام اناس کس مکتوم"
 آغا صاحب۔ آپ جواب دیجئے۔
 آغا صاحب۔ آپ کیا جواب دیں گے۔ یہ شعر سنئے۔
 ہم اوس نازک ادا کی مشنوں پر جان دیتے ہیں
 شتر کے جبین غم سے ہوں فرس کی جبین چل بل
 آغا صاحب۔ اچھا نہ ہی۔ یہ سنئے۔
 میں دل کو پیر ڈالوں گا جو تم پہلو سے اٹھ جاؤ
 میں آنکھیں پھوڑ ڈالوں گا جو تم آنکھوں کو اچھل
 آغا صاحب۔ خوب۔
 آغا صاحب۔ تمہاری سادگی میں کچھ عجب عالم نکلتا ہے
 نہ چوٹی ہو نہ گنگھی ہو۔ نہ مٹی ہو نہ کابل ہو
 امراؤ جان۔ آدمی تو کیا دن رات شرجھاؤ۔ منہ پہاڑ بیٹھا رہے
 آغا صاحب۔ سادگی کا بھی فرا ہے۔ اور دوسرے خرق کی بھی کفایت ہے۔
 اس مذاق میں لطیف ہے کہ امراؤ جان کسی قدر جیس میں شہور حسین۔
 مٹکا ہم سے وہ جب لاجپن اور حسین ہو گئے ہر دو ہیں
 نہ بیک بیک ہونہ بھیک بھیک ہو نہ بیک بیک ہو نہ بیک بیک ہو
 آغا صاحب۔ کیا معرکہ کہا ہے۔
 آغا صاحب۔ اوپر کا معرکہ بھی خوب لگایا۔ وہی ازل کی رعایت چلی جاتی ہے۔

امراؤ جان۔ ہتے ہتے لوٹی جاتی تھیں۔
آغا صاحب۔ اچھا تو اب ایسے شعر پڑھیں۔ ہمارا عشق ذلیل ہو جاتا ہے
نازک خیالی کہتے۔

تری نازک کمر کے باب میں چیلک بنا دیجیے
دہ لیا مجھے۔ بارگاہی طبیعت جسکی کھل ہو
خانصاحب۔ میں جلم کہہ لیتا ہوں کہ تیری طبیعت ایسی ہے جیسا آب ارشاد
فرماتے ہیں۔ گریاے خدا اس چیلک کے معنی سمجھا دیجیے۔

آغا صاحب۔ خیر غلط ہے۔ سن لیجئے۔ مجاہب لوگ خانہ پوری کے لیے بجائے
نادر کے نشان + بنا دیا کرتے ہیں۔ اسلئے اس سے یہ مطلب نکلا کہ کمر بند و
ذوہرت ایک خط نہ بچوں بچ سے دوسری کو کاٹ دیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر

ہو کہ عشق کی کمر کٹی ہوئی اور پھر جڑی ہوئی بھی ہے۔
خانصاحب۔ یہ کیونکر؟ آغا صاحب۔ اب اس باریکی کو نہ بوجھئے؟ خیر حضرت
 واضح ہو کہ چیلک علم باطنی ن علامت جمع کی ہے لطف ہے کہ علامت کی کوئی
مقدار نہیں ہوتی۔ مطلب یہ نکلا کہ کمر باوجود معدوم ہونے کے جسم کے دونوں حصوں

کو جوڑے ہوئے ہے۔
اجاب حضرت بس نازک خیالی کی حد ہو گئی۔ جو کوئی اپنے علم جاننا ہو وہ آپ کے شعر
آغا صاحب۔ اسی سے تو میں ایسے دلیوں کے سامنے پڑھا ہوں۔ اس کو سزاوار
دعوم زندہ ہوئے نہیں تو ان شعروں کی کچھ داد ملتی۔ اب سمجھنے والوں میں کون
رہ گیا ہے۔ خیر۔ اب قطع سن لیجئے۔ طبیعت کلفت ہو گئی۔ کوئی قدر دان نہیں ہے۔
بس اسے قزاق بس اطمینان قیامت خیز کو روکو
غضب ہو جائے گا تو جی بھائی میں جہل علی

اجاب۔ قطع پھر عنایت ہو۔ آغا صاحب نے دوبارہ پڑھا۔
نواب صاحب۔ کیا ضرورت غصہ رکھنا ہے۔ قزاق!۔
آغا صاحب۔ صاف فرمائیے گا ہے تو کچھ ایسا ہی مگر کچھ ایسا نازک یا نہیں ہے۔
ایک تو خانہ زانی اعتبار سے۔ اسلئے کہ فدوی کے آباد اجداد شہت بچاؤ۔ میں
لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ دوسرے اس سبب کہ اوستاد موم سارن قلعہ فرماتے تھے
اب یہ کچھ ایسا نامناسب بھی نہ تھا۔ اسلئے کہ (ادبکی روح شرمندہ ہو) عمر بھر اگلے شاہزاد

کے مضمون پڑا ہوا کے موزون فرمایا کیے۔ سارا دیوان ملاحظہ کر لیجئے۔ شاید ہی کوئی شعر
نیا ہو۔ جب اشہب غامد کی کلام میرے دوست خندار میں آئی تو میں نے سزا کرانی خان
کے مافی الجحیم کے قزاق خاص رکھ لیا۔ کچھ نہ تھی۔ ہمیں ایک طرح کا باہمن تو ہے۔
بندہ کا یہ وسوسہ رہا ہے اور ہے گا کہ شعر اس ماضی و حال و استقبال کے مضامین پر ردی
تھیں جنہیں کے اپنے ہضم نصرت میں کر لوں گا۔
نواب۔ بہت مبارک!۔

شاعرہ غم ہونے کے بعد فالس کی برت جاتی گئی۔ ادبکی دود و غلبان اجابے خوش
کین۔ سب اپنے اپنے مکان کو تشریف لے گئے۔ اس کے بعد شعر خوان بچا۔ فشی صاحب۔
نے اور میں نے اور امراؤ جان نے کھانا کھایا۔

فشی صاحب۔ امراؤ جان سے (ذرا اپنا وہ مطلع تو پڑیے جو آپ نے پہلے پڑھا تھا
امراؤ جان۔ کسکو سننا میں حال دل نادر سے آدا
آدراگی میں سمجھنے والے کی سیر کی

فشی صاحب۔ ہمیں شک نہیں کہ آپ کے حالات بہت ہی الجھپ رہ گئے ہیں
آپ نے یہ مطلع پڑھا ہے۔ مجھے بھی خیال ہے۔ اگر آپ اپنی سرگزشت بیان کریں تو
لطف سے خالی نہ ہو گا۔

میں نے بھی فشی صاحب کے کلام کی نائیدی۔ مگر امراؤ پہلو بچا جاتی تھیں۔
ہمارے فشی صاحب ہر بان کو ابتدا سے سن سے قصہ کہانیوں کا بڑا عشق تھا۔ اللہ علیہ
امیر حمزہ کی داستان کے علاوہ بوستان خیالی کی کل جلدیں نظر سے گذری ہوئی
تھیں۔ کوئی نادر ایسا نہ تھا جو آپ نے نہ دیکھا ہو۔ مگر گفتگو میں چند روز رہنے کے بعد جب
اہل زبان کی اصلی بول چال کی خوبی ملی۔ اکثر نادر دلیوں کے بے تکے قصے مصروفی
زبان۔ اور حسب آئینہ ادب یہ وہ خوش دلانے والی قہرور آپ کے دل سے اڑتی
تھیں۔ لکھنؤ کے بازاں کو کون کی لکھنؤ بہت ہی پسند آتی تھی۔ امراؤ جان کے اس
مطلع نے آپ کے دل میں وہ خیال پیدا کیا جیسا اشارہ اور کیا گیا ہے۔ لکھنؤ
فشی صاحب کے عشق اور میری اشتیاق نے امراؤ جان کو مجبور کیا۔ اور وہ اپنی
سرگزشت کہنے پر راضی ہو گئے۔

ہمیں کچھ شک نہیں کہ امراؤ جان کی غزیر بہت شستہ تھی۔ اور کون ہو۔ اول تو

خاندہ۔ دوسرے اعلیٰ درجے کی دہلیوں میں پرورش پائی۔ خاندون اور نوازادوں کی صحبت اور غنائی۔ محلات شاہی تک رسائی ہوئی۔ جو کچھ انھوں نے آنکھوں سے دیکھا اور لوگوں نے کانوں سے نہ سنا ہوگا۔

اپنی سرگزشت وہ جس قدر کہنی جاتی تھیں میں اون سے چھپا کے لکھتا جاتا تھا۔ تمام ہونے کے بعد میں نے مسودہ دکھایا۔ اس پر مراد جان بہت ہی مگزن۔ مگر اب کیا ہوتا تھا۔ آخر کچھ کچھ بوجھ کے چپ ہو رہیں۔ خود پڑھا اور جا بجا جو کچھ لکھا تھا۔ اسے درست کر دیا۔

میں مراد جان کو اس زمانے سے جانتا ہوں۔ جب اون سے نواب صاحب سے ملاقات تھی۔ اور تھیں دونوں میری نشست بھی وہاں اکثر رہتی تھی۔ اس سرگزشت میں جو کچھ بیان ہوا ہے مجھے اس کے حرفت صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ مگر میری ذاتی رائے ہے۔ ناظرین کو اختیار ہے جو چاہیں قیاس کر لیں۔

مرزا رسوا۔

کھنڈہ اری۔ ۱۹۹۰ء۔

۱ امراؤ جان ادا

لطف ہے کون سی کہانی میں۔

آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی۔

میں نے مرزا رسوا صاحب۔ آپ مجھے کیا چھپر چھپر دے دیے ہیں۔ مجھ کو نصیب کی سرگزشت میں اب کیا خزاں ہے جسکے آپ نشان ہیں۔ ایک ناشاد نامراد۔ وطن آوارہ خانان۔ برباد تنگ خاندان۔ عار و جہان کے حالات سنکے مجھے ہرگز امید نہیں کہ آپ فوس ہوں۔ اچھا سینے۔ اور اچھی طرح سینے۔

باپ دادا کا نام ہے کہ اپنی سرخروئی جتانے سے فائدہ کیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے باوجودی نہیں۔ مان اپنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلے میں میرا گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ اس پاس کچھ کچھ مکان۔ کچھ چھوڑے۔ کچھ کھیر بلین۔ رہنے والے بھی ایسے ہی دیے لوگ ہونگے۔ کچھ بہشتی۔ کچھ نانی۔ دھوبی۔ کہار۔ میرے مکان کے سوا ایک اور گھر اس محلے میں ادبھی تھا۔ اس مکان کے مالک کا نام دلاور خان تھا۔

میرے آبا بوبیک صاحب کے چھپرے پر نوکر تھے۔ معلوم نہیں کاسے میں ام تھا۔ کیا خواجہ جی اتنا یاد ہے کہ لوگ انکو معذور کہتے تھے۔

جب سے میں اپنا قصہ شروع کرتی ہوں میرا سن گیا رہ برس کا تھا۔ میرا ایک چھوٹا بھائی تھا اس کا سن کوئی تین برس کا ہو گا۔

دن بھر میں اپنے بھائی کو کھلایا کرتی تھی۔ اور وہ بھی مجھ سے اس قدر ہلکا ہوا تھا کہ دم بھر کے لیے نہ چھوڑتا تھا۔

بوسے مکان سے زیادہ اونچا نہ تھا اور سب ایک کٹھریا کھیرل میں رہتے تھے۔ میرے مکان میں کہنے سنانے دو دالان تھے۔ صدر کے دالان کے آگے کھیرل پڑی ہوئی۔ ادھر ادھر دو کھیریاں تھیں۔ سامنے دالان کے ایک باؤں پر چٹان تھا۔ دوسری طرف کوٹھے کا زینہ۔ کوٹھے پر ایک کھیرل دو کھیریاں۔ کھانے پکانے کے برتن ضرورت سے زیادہ تھے۔ دو چار دریاں چاندنیاں بھی تھیں۔ کسی چیز پر جلنے کے لوگ ہمارے گھر سے مانگنے آتے تھے۔ ہمارے گھر میں بہشتی پانی بہتا تھا۔ محلے کی عورتیں کوئٹہ سے خود ہی بھر لاتی تھیں۔ بہار آجائے گھر سے ودی نہیں کے پھٹتے تھے لوگ اُٹھیں بھجک بھجک کے سلا میں کرتے تھے۔ میری امان ڈولی پر سوار ہو کے جہان جانی تھیں۔ ہمایان پاؤں پیدل ماری ماری پھرتی تھیں۔

صورت شکل میں بھی میں اپنی سچو لہو سے ابھی تھی۔ اگرچہ حقیقت خوبصورتوں میں میرا شمار نہیں ہو سکتا۔ مگر ایسی بھی نہ تھی جیسی اب ہوں۔ گلشنی ہوئی چھٹی رنگت تھی۔ ناک نقشہ بھی خیر کچھ ایسا بڑا نہ تھا۔ ماتھا کسی قدر اونچا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ بچپن میں چوٹے چوٹے گال تھے۔ ناک اگرچہ سو تو ان نہ تھی مگر کچھ اونچا اور پریہ پھری تھی نہ تھی۔ ذیل ڈول بھی بس کے موافق آچھا تھا اگرچہ اب ویسی نہیں رہی۔ ناز کون میں میرا شمار نہ جب تھا اب ہے۔ اس قطع پر پاؤں میں لال گلاب کا پانچا تھ۔ چھوٹے چھوٹے پانچون کا۔ ٹول کا نیکہ۔ منو کی کرتی تریب کی اور صنی۔ ماتھون میں جانی کی تین تین چوڑیاں۔ گلے میں طوق۔ ناک میں سونے کی تھنی۔ اور سب زکون کی تھنیان چاندی کی تھیں۔ کان ابھی نانے ناز سے چھڑے تھے امنین صرف نیلے ڈوسے پڑے تھے۔ سونے کی بالیاں بننے کو گئی تھیں۔

میری شادی میری چھوٹی کے لڑکے کے ساتھ چھری ہوئی تھی۔ گلشنی فوریں کے بن میں ہو گئی تھی۔ اب ادھر سے شادی کا تقاضا تھا۔ میری چھوٹی فو اب گلشنی میں رہا ہی نہیں۔ چھوٹا ہمارے زمیندار تھے چھوٹی کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ بڑا تھا۔ گلشنی چوٹے سے پہلے میں کئی مرتبہ اپنی مان کے ساتھ وہاں جا چکی تھی۔ وہاں کے کارخانے ہی اور کچھ مکان تو کچھ تھا مگر بہت وسیع دروازے پر چھڑے ہوئے تھے۔ گلے پہلے جلیبیں بند جلیبیں گلی دودھ کی اہلہ اٹھتی۔ انداز کی کثرت۔ ٹھون کی فصل میں ٹوکرون مجھے چلے آئے ہیں

آجائے شام کو کوکری پرے آتے تھے اور سوت کی خوشی ہم جانی بہنوں کی کچھ بوجھے میں کمرے پٹ گئی۔ بھائی آنا آنا کر کے دوڑا دین میں جھٹ گیا۔ آبا کی باجھ میں اسے خوشی کے چلی جاتی ہیں۔ بھگوارا بھٹ پر ماتھ بھرا۔ بھگوارا کو دین اوٹھا لیا۔ بار کرنے لگے۔ مجھے یاد ہے کہ کبھی خالی ماتھ گھرنے آتے تھے۔ کبھی دو کتا رے ماتھ میں ہیں۔ کبھی بناسون یا تل کے لہوڑن کا ڈنالیہ ہوتے ہیں۔ اب اسکے جیسے لکائے جا رہے ہیں۔ اس وقت جانی بہنوں میں کس مزے کی لڑایاں ہوتی تھیں۔ وہ کتا را چھینے لیے جاتا تھا۔ میں مٹھائی کا ڈنالا تھیا لیتی ہوں۔ امان سامنے کھیرل میں بیٹھی کھانا پکا رہی ہیں آبا ادھر آکے بیٹھے نہیں ادھر سے فناضے شروع ہو گئے۔ آبا لہوڑن میں لائے۔ "دیکھو میرے پاؤں کی جوتی کیسی ٹوٹ گئی ہے۔ تمکو تو خیال ہی نہیں رہتا؟" "لو بھی تمکو میرا طون سنا کے مان سے بن کے نہیں آیا چھوٹی خالہ کے لڑکے کی دودھ بڑھائی ہے بھی میں کیا پس کے جاؤ گی؟ چاہے کچھ بوجھ کے دن تو میں نیا جوڑا پہنوں گی وہاں میں تو نیا پہنوں گی۔ جب امان کھانا پکا چکے ہیں مجھے آواز دی۔ میں کئی روٹی کی کوکری اور سالن کی چٹنی اور نمالائی۔ دسترخوان بچھا۔ امان نے کھانا کھا لایا۔ سب سے سر جوڑ کے کھانا کھایا۔ خدا کا شکر کیا۔ آبانے عات کی نماز پڑھی سو رہے۔ صبح کو لڑکے آبا آئے۔ نماز پڑھی اوس وقت میں کھڑک سے اوشد بھی پھڑما میں شمع شروع ہو گئیں۔

"میرے آبا۔ آج نہ جھولنا۔ گرناں ضرور لیجئے۔ آبا شام کو بہت سارے امرود اور نالیاں لانا۔۔۔۔۔"

آبا صبح کی نماز پڑھنے کے وظیفہ پڑھتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے۔ کبوتروں کو کھول کے داند دیتے تھے ایک دو ہوا اڑتا ہے۔ اتنے میں امان جھاڑو بہار سے فراغت کر کے کھانا تیار کر دیتی تھیں کیونکہ آبا پھر دن چڑھ سے پہلے ہی کوکری پر چلے جاتے تھے۔ امان سینا۔ پرونا۔ لے کے چھٹی تھیں۔ میں بھتا کو لے کے کہیں۔ گلشنی میں کل گئی یا دروازے پر املی کا درخت تھا وہاں چلی گئی۔ بھوئی لڑکیاں لڑکے جمع ہوئے۔ بھتا کو بھتا دیا۔ خود میل کو دین ضرور ہو گئی۔ مانے کیا دن تھے۔ کسی بات کی فکر ہی نہ تھی۔ اچھے سے اچھا کھاتی تھی۔ بہتر سے بہتر پہنتی تھی کیونکہ بھوئی لڑکے زکون میں کوئی بھگوارا نہ ہے بہتر نظر نہ آتا تھا۔ دل کھلا ہوا تھا۔ کھانے میں بھی بونی نہ تھیں۔ جہان میں بہت تھی وہاں کوئی کھانا

سکھ روں کی چاندیان کی چاندیان ٹہری ہوئی ہیں۔ اوکھ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ کوئی کہان تک کھائے۔

بے اپنے دو لہار (یعنی جسکے ساتھ خادی ٹھہری تھی) کو بھی دیکھا تھا۔ بلکہ ساتھ کھینچی آبا پورا چیز کا سامان کر چکے تھے۔ کچھ روپے کی اور فکر تھی۔ رجب کے مہینے میں شادی کا تقرر ہو گیا تھا۔

رات کو آبا امان میں جب میری شادی کی باتیں ہوتی تھیں بچے چپکے سن کر تھی۔ اور دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ واہ میرے دو لہار کی صورت۔ کر میں (ایکٹھینے کی لڑکی کا نام تھا جو میرے بہن تھی) کے دو لہارے آچھی ہے۔ وہ تو کلا کلا ہے میرا دو لہار گورا ہے۔ کر میں کے دو لہار کے منہ پر کیا ٹھری سی داڑھی ہے۔ میرے دو لہار کے بھی مونچھیں بھی اچھی طرح نہیں نکلیں۔ کر میں کا دو لہار ایک میلی سی دھوئی باندھے رہتا ہے۔ ماشی زنجی ہوئی رزنی پہنتا ہے۔ میرا دو لہار عید کے دن کس ٹھاٹھ سے آیا تھا۔ بنبر بنر پھینٹ کا دھلا۔ گلبدن کا پانچا۔ مصالہ کی ٹوپی۔ مٹلی جوتہ۔ کر میں کا دو لہار میں ایک پھینٹا باندھے ہوئے گنگے پاؤں پھرتا ہے۔

غرض کہ میں اپنی حالت میں خوش تھی۔ اور کون نہ خوش ہوتی کیونکہ اس سے بہتر کوئی اور حالت میرے خیال ہی میں نہ آسکتی تھی۔ مجھے اپنی تمام آرزو میں بہت ہی جلد پوری ہوتی معلوم ہوتی تھیں۔

مجھے یاد نہیں کہ جبکہ میں اپنے ماں باپ کے گھر میں رہی مجھے کوئی صدمہ بھونچا ہو مگر ایک مرتبہ میری اڑکھلی کا ایک چھلچھلا ڈھیر سی کھیلنے میں جاتا رہا تھا۔ بڑا چاندی کا تار تھا۔ شاید ایک آنے سے زیادہ کا ہوگا۔ یہ اب کہتی ہوں اور وقت آتی چیز کہان تھی۔ قیمت کسی چیز کی مجھے معلوم ہی نہ تھی۔ میں چٹلے کے لیے میں اتنا دلی کہ انکھیں پکڑ کر امان سے بدن بھر چھپایا آخر جب رات کو انھوں نے اڑکھلی خالی دیکھی مجھے حال ہو چھا۔ اب کہنا ہی پڑا۔ امان نے ایک ٹھانڈی میرے منہ پر مارا۔ میں چپین مارا کے روئے لگی۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ ارنے میں آبا آگئے۔ انھوں نے مجھے ہچکا مارا۔ امان پر خفا ہوئے۔ اور وقت میرے دل کو کسی قدر تسکین ہوئی۔

بیشک آبا مجھے امان سے زیادہ چاہتے تھے۔ آبا نے کبھی غول کی چھری نہیں چھوئی

آنان دراز نامی بات پر ابھی تھیں۔ امان چھوٹے بچا کو بہت چاہتی تھیں۔ چھوٹے بچا کے لیے بیٹے بہت مار کھائی۔ مگر کبھی مجھے اوس سے انتہائی محبت تھی۔ امان کی صند سے تو کبھی کبھی دو دو پتھر تک میں نے گود میں نہیں لیا۔ مگر جب انکی آنکھ اوجھل ہوئی فوراً گلے سے لگا لیا۔ گود میں اوتھا لیا بار کر لیا۔ جب دیکھا امان آئی ہیں۔ جلدی سے اوتا لیا۔ اب وہ روئے لگا۔ اس پر امان یہ سمجھتی تھیں کہ میں نے اوتا دیا۔ لگین گھر کیا نہ دینے۔ یہ سب کچھ غما گھر جہاں میری اڑکھلی دیکھی اور امان بے قرار ہو گئیں۔ کھانے پینے کا ہوش نہیں۔ راتوں کو نیند حرام۔ کسی سے دوا پوچھتی ہیں۔ کسی سے تونیز ملکا تھی ہیں۔ میرے جہیز کے لیے اپنے ہاتھ گلے کا سب گنا اور انار کے آبا کے حوالے کیا۔ کہ بہن ٹھوڑی باندی ملو کہ بھرے بنواد۔ دو ایک عدد جوئے بنے ہوئے ہیں انکو ملو اور۔ گھر کے بڑوں سے دو چار رکھ لیے باقی کمال کے الگ کر لیے کہ نہر طعی کرادو۔ بلکہ آبا نے کہا بھی کہ کچھ اپنے اٹھ کا بھی خیال رکھو۔ امان نے کہا۔ اوہ جی ہوگا اتھاری ہیں زمیندار کی پوری ہیں وہ بھی تو جاہن کہ بھائی نے لڑکی کو کچھ دیا۔ لاکھ تھاری ہیں میں مسلسل کا نام بڑا ہوتا ہے۔ میری لڑکی تنگی ہو جی جاگی تو لوگ ملنے دینگے۔

زارا صاحبہ میں نے اپنے ماں باپ کے گھر ادبچین کی حالت کا پورا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دیا ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر میں اوس عالم میں بنی تو خوش رہتی یا ناخوش۔ اسے آپ خود قیاس کر سکتے ہیں۔ میری عقل ناقص میں تو یہ آبا ہے کہ میں اسی حالت میں ابھی رہتی۔

ابتدا آوارگی کی جوش محنت کا سبب ہم تو مجھے یمن مکرنا صبح کو سمجھائیں گے کیا

میں نے اکثر لوگوں کو کہنے سنا ہے کہ جو ذات کی رڈیاں میں ادا کا توڑ کر کیا ہے کچھ نہ کیا کم ہے کیونکہ وہ ایسے گھر اور ایسی حالت میں پیدا ہوئی ہیں جہاں سوائے بیکاری کے اور کسی چیز کا تذکرہ ہی نہیں۔ ماں بہن جسکو دیکھتے ہیں اوسی حالت میں ہے۔ مگر یہ ماں باپ کی بیشیاں جو اپنے گھر دن سے کل کے خراب ہو جاتی ہیں انکو وہاں مارے جہاں پانی ملے۔

سیر بخش۔ کیا یہ بھی ارادہ ہے۔

دلاور خان جب کسان کسان ہمارے مکان سے تھوڑی دُور گُھٹا۔ ٹواڈ کی تون سے بلا ہوا تھا۔ لکھنؤ میں برسوں خیر رہا۔ اسی زمانے میں انہیں معلوم کیسکی سفارش سے چھوٹ آیا تھا۔ اُٹا سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ وجہ یہی کہ جب فیض آباد میں یہ گزرا ہوا تو محلے سے اسکے چال چلن کی خفیقات کے لئے لوگ طلب ہوئے۔ اولین آبا بھی تھے۔ آبا بچا کہ یون بھی دل کے سادے اور زبان کے سچے تھے۔ اوپر مظلوم ہو کر گرائی دے صاحب نے ان کے ہاتھ میں قرآن وے کے پوچھا۔ "دل تمہارا تم سچ سچ کہے یہ کیسا آدمی ہے؟" انہ نے صاف صاف جواب دیا تھا کہ دیا۔ انھیں کی کو اپی پر دلاور خان خیر ہو گیا۔ یہ حال میں نے اپنی ماں سے سنا تھا۔ وہی کہنے اوسکے دل میں چلا آتا تھا۔ ابکی جب خیر سے چھوٹ کے آیا تو اسے آبا کی خیر پر کبوتر پالے۔ ایک دن اسے آبا کا ایک کبوتر ملا۔ اپنے کو گئے دیا۔ آبا چار آنے دینے تھے۔ وہ آٹھ آنے لگتا تھا۔ آبا تو کڑی پر چلے گئے۔ جھٹ بٹے وقت خدا جانے میں گھر سے کون کھلی تھی مدد کیجی کیا ہوں۔ اربلی کے بچے کھڑا ہوا ہے کہنے لگا۔ چلو بیٹا تمہارے آبا پیسہ دے گئے تھے کبوتر لے لو۔ میں اوسکے دم میں آگئی۔ ساتھ چلی گئی۔ جا کے جو دیکھتی ہوں گھر میں کافی چڑیا نہیں۔ کیا کلاں پڑا ہے۔ اوپر میں گھر میں داخل ہوئی اور دھراوے اندر سے کُندی بند کر لی چاہی ہوں

دلاور خان - تم سمجھنے کیا ہو۔ جان سے نہ مارا ہو تو جہان کا خشم نہیں۔
پیر بخش - بھئی تم قول کے سچے ہو۔ جو کہو گے کر دکھاؤ گے۔

دلاور خان - دیکھنا۔

پیر بخش - اور اسے کیا کر دے۔

دلاور خان - کریں گے کیا۔ یہیں کہیں مار کے نالے میں تو بے دو۔ راتوں رات گھر
چلے چلو۔

یہ بات سن کر مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو غم گئے۔ دل میں ایک چھپکا
سا بھونکا۔ ٹوکا دھل گیا۔ ماتھے پاؤں ڈال دیے۔ یہ حال دیکھ کے ابھی تو اسے گھر کو رستہ آیا۔
اور ایک گھونسا زور سے میرے پیچھے رہا کہ میں ہلکا گئی۔ قریب تھا کہ گر پڑوں۔
پیر بخش - اسے تو مار ڈالو گے اور ہمارا پیو۔

دلاور خان - کٹے کٹے پانی۔

پیر بخش - کہاں سے دو گے۔ ہم تو بچہ اور ہی سمجھتے تھے۔

دلاور خان - گھر تو چلو۔ کہیں کے نہ ہو سکے گا تو کوترج کے دیو ن گا۔

پیر بخش - تم تو بے عقل ہو۔ کوتر کیون بچو۔ ہم نہ ایک بات بتائیں۔

دلاور خان - کو۔

پیر بخش - آراں لکھو میں چل کے ابی چھو کری کے کوڑے کرو۔

جب سے اپنے مرے کا یقین ہو گیا تھا مجھے ان دونوں نوزیوں کی باتیں کا دل
اچھی طرح سنائی نہ دیتی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی خواب میں باتیں کر رہا ہے
پیر بخش کی بات سن کر میرے دل کو بھرا اپنی زندگی کا کچھ آسرا بندھا۔ دل ہی دل میں پتھر
کو دعا میں دینے لگی۔ مگر اب یہ انتظار ہے کہ دیکھوں یہ نوزی کیسا کہتا ہے۔

دلاور خان - آجھا دیکھا جائے گا۔ ابھی تو چلے چلو۔

پیر بخش - یہاں نہ اٹھ رہا میں وہ سامنے درخت کے نیچے آگ جل رہی ہے توڑی
میں آگ نے آئین تو ختم بھرن۔

پیر بخش تو آگ لینے گیا۔ مجھے پھر یہ خوف پیدا ہوا۔ کہیں پیر بخش کے آنے آتے یہ میرا کام
نہام کر دے۔ جان کا خوف بڑا ہوتا ہے۔ اکبار کی زور سے چیخ ماری۔ چیخ کا مارنا تھا کہ لاؤنا

نے دو تین ملا پچھ میرے منہ پر کس کس کے گلے دراغزادی چپ نہیں رہتی۔ ابھی چھری
چونک دو گھا۔ نیل کرنی ہے۔

پیر بخش (ابھی توڑی ہی درگیا ہو گا) نہیں بھی نہیں۔ ایسا کام نہ کرنا۔ تحین ہمار
سر کی قسم۔ آراں میں تو آ لینے دو۔

دلاور خان - آجھا جاؤ آگ لے آؤ۔

پیر بخش گیا اور توڑی دیر کے بعد آگ لے کے آیا۔ حقہ بھرا۔ دلاور خان کو دیا۔
دلاور خان - (ایک کسٹ مجھے کا پی کے) تو یہ کتنے تک بچا لگی؟ اور بچے کا کون؟
ایسا ہو کہیں پکڑے جائیں تو اور مشکل ہو۔

پیر بخش - اسکا ہمارا ذمہ ہم تو بچ دینگے۔ اسے میان تمہاری باتیں۔ پکڑے کا کون
لکھو میں ایسے معاملے دن رات ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے سارے کو جانتے ہو؟

دلاور خان - کریم۔

پیر بخش - مان۔ اور کسی روٹی ابی پر ہے۔ بیویوں لڑکے لڑکیاں پکڑے گیا۔ لکھو
میں جا کے دم کھڑے کر لیے۔

دلاور خان - آج کل کہاں ہے۔

پیر بخش - کہاں ہے؟ لکھو میں ہو گا۔ گرتی اسکا ہار او کی سسرال ہے وہیں ہو گا
دلاور خان - بھلا لڑکا لڑکی کتنے کو بچتے ہیں؟

پیر بخش - جیسی صورت ہوئی۔

دلاور خان - بھلا یہ کتنے کو بک یا لگی۔

پیر بخش - سو ڈیڑھ سو۔ جیسی تمہاری تقدیر ہوئی۔

دلاور خان - بھائی کی باتیں۔ سو ڈیڑھ سو۔ اسکی صورت ہی کیسا ہے۔ تو بھی نہیں
تو بہت ہے۔

پیر بخش - آجھا اس سے کیا ہے۔ لے تو چلو۔ ارڈالنے سے کیا فائدہ۔

اسکے بعد دلاور خان نے پیر بخش کے کان میں کچھ عجیب کے کہا جو کہ میں نے
نہیں سنا۔ پیر بخش نے جواب دیا۔ وہ تو ہم سمجھے ہی تھے۔ تم کیا ایسے ہو تو وہ؟
رات بھر کاڑی جھلائی۔ میری جان سامنے میں تھی۔ موت آنکھوں کے سامنے

پھر ہی تھی۔ رفت سلب ہو گئی تھی۔ بدن سن ہو گیا تھا۔ آپ نے سنا ہو گا کہ منہ بند
سولی پر بھی آتی ہے ٹھوڑی دیر میں آکھ لگ گئی۔ ترس خدا کر کے پر بخش ہے بلوں کا کل
اوڑھا دیا۔ رات کو کئی مرتبہ چونک چونک پڑی۔ آکھ کل جانی تھی۔ مگر ڈر کے مارے
چٹکی پڑی تھی۔ آخر ایک مرتبہ ڈرتے ڈرتے نہ ہرے کلمی سر کا کہ جو دیکھا معلوم ہوا میں لکڑی
میں آگلی ہوں۔ پردے سے جھانک کے دیکھا۔ سامنے کچھ کچھ کچے کچے مکان ہیں۔ ایک
بیلے کی دوکان ہے۔ دلاور خان اور پر بخش دونوں کچھ خرید رہے ہیں۔ بیل سٹے
برگ کے درخت کے نیچے جلوسہ کھا رہے ہیں۔ د زمین گزار آلاڑ کے پاس بیٹھے ہوئے ہوں
رہے ہیں۔ ایک چلمی رہا ہے۔ اتنی دیر میں پر بخش نے گاڑی کے پاس آکے ٹھوڑے
سے بیٹھے ہوئے جھنگو دیے۔ میں رات بھر بھوک تھی۔ کھانے لگی۔ ٹھوڑی دیر کے
بعد ایک لڑکا پانی لاکے دیا۔ میں نے ٹھوڑا سا پایا۔ پھر چٹکی ہو کے پڑ رہی۔

بڑی دیر تک گاڑی یہاں ٹھہری رہی۔ پھر پر بخش نے بیل جو ہے۔ دلاور خان جھد
بھر کے میرے پاس آجھٹا۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ آج دن کو مجھے زیادہ سختی نہیں ہوئی
نہ دلاور خان کی چٹری کھلی نہ مجھے گھوڑے سے ڈر نہ گھڑکیان۔ دلاور خان اور پر بخش
دونوں جگہ جگہ رہتے پھر گھر کے بیٹھے۔ باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جب باتیں کرتے
کرتے تھک گئے کچھ کھانے لگے۔ ایک گانا ہے۔ دوسرا چکاشن رہا ہے۔ سن کیا رہا ہے
سوچ رہا ہے کہ اب کیا بات نکالوں۔ پھر کوئی بات نکل آئی۔ اس گفتگو میں اکثر ایسا بھی
ہوا کہ آپس میں کالی کلوچ ہونے لگی۔ آستینیں جڑمکنیں کر رہی جاتے لگیں۔
ایک گاڑی پر سے کود اترتا ہے۔ دوسرا وہیں کلا گھونٹنے کو تیار ہے۔ پھر کسی بات پر
دونوں ڈھیلے پڑ گئے۔ بات رفت گذشت ہوئی۔ پھر رلاپ ہوا۔ دوسری کی باتیں ہوتے
لگیں۔ گویا کبھی اڑے ہی نہ تھے۔

ایک۔ ہمارے چارے لڑائی ہی کیا۔ بات کی بات تھی۔
دوسرا۔ بات ہی کیا تھی۔

پہلا۔ اچھا تو پھر اس بات کو جانے دو۔
دوسرا۔ جانے دو۔

دسے پھر کئے کی اجازت صیاد
شب اول ہے گرفتاری کی

گرفتاری کی شب اول کا حال تو آپ سن چکے۔ اے! وہ بے بسی مرتے دم تک
نہ جھٹکوں گی۔ مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیونکر زندہ بھی۔ ہے ہے کیا سخت جان
تھی کہ دم نہ نکلا۔ دلاور خان بندے! دنیا میں تو خیر تو اپنی سزا کو بھونچا۔ مگر کیا اس سے
میرے دل کو تسکین ہوئی۔ میرے کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کے چیل کو ڈون کو کھلائی تو
بھی مجھے آہ نہ آئی۔ یقین ہے کہ قبر میں چمچ و شام جہنم کے کندے پڑتے ہوئے ابد
قیامت کے دن خدا چاہے تو اس سے بدتر درجہ ہو گا۔
اے حیران باپ کا کیا حال ہوا ہو گا۔ کبے تیری جان کو کھینچے ہو گئے۔
بس مرزا صاحب اتنی آج کبھی بانی کل کہوں گی۔ اب میرا دل ہے کہ اٹھا چلا آتا ہے۔
جی چاہتا ہے خوب چھین مارا کے روؤں۔

آپ میری آواز کی سرگزشت سننے کیا کیجیے گا۔ بہتر ہے کہ کہیں تک رہنے دیجئے۔
میں تو یہ کہتی ہوں کہ سن دلاور خان مجھ کو ہاری ڈالتا تو اچھا تھا۔ ٹھٹھی بھر خاک سے
میری آبرو دھک جاتی۔ میرے ماں باپ کی عزت کو دھتہ نہ لگتا۔ یہ دین و دنیا کی
روسیا ہی تو نہ ہوتی۔

ان میں نے اپنی ماں کو ایک بار پھر دیکھا تھا۔ اسکو بھی ایک زمانہ ہوا۔ اب خدا جانے
جیتی ہیں یا مر گئیں۔ سنا ہے کہ چھوٹے بھائی کے ایک لڑکا ہے ماشا اللہ! چودہ پندرہ
برس کا۔ دو لڑکیاں ہیں۔ میرے بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان سب کو دیکھوں۔ کچھ ایسا تو
بھی نہیں مرے ایک روپے میں تو آدمی فیض آباد بھونچ سکتا ہے۔ مگر کیا کروں مجھ پر
اس نالے میں جب ریل نہ تھی فیض آباد سے لکھنؤ چار دن کا راستہ تھا۔ مگر دلاور خان
اس خوف سے کہ کہیں میرا پتہ سمجھا کر ہے نہیں معلوم کن میٹر استون سے لایا کر کوئی
آٹھ دن میں لکھنؤ بھونچی۔ مجھ کو لکڑی کو کیا خبر تھی کہ لکھنؤ کہاں ہے۔ مگر دلاور خان اور
پر بخش کی باتوں سے میں آنا کچھ کئی تھی کہ یہ لوگ مجھے دین لیے جاتے ہیں۔

لکھو کا نام میں گھر میں سنا کرتی تھی۔ کہ نہ کہ میرے ناما ہیں کسی محل کی ڈوڑھی پر سپارن
میں نوکر تھے گھر میں اکھا ذکر ہوا تھا تھا ایک مرتبہ وہ فیض آباد گئے تھے۔ میرے
بچے بہت سی مٹھائی اور کھلونے لے گئے تھے۔ میں انھیں اک جھی طرح پہناتی تھی۔
لکھن میں کوئی اور سپارکریم کی سسرال میں مجھے لا کر اتارنا۔ چھوٹا سا کھانا
کریم کی ساس۔ موٹی ٹوڑے ٹوٹی سی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے گھر میں لگی۔ ایک کوٹھی
میں بند کر دیا۔ صبح ہوتے لکھن جو بچی تھی۔ دو پہر تک بند رہی۔ پھر کوٹھی کا دروازہ
کھلا۔ ایک جوان سی عورت (کریم کی جود) تین چائیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں
چمچ بھر مٹھائی کی دال۔ اور ایک بدھنی پانی کی میرے آگے رکھ کے چلی گئی۔ مجھے اور موت
وہ بھی نعمت ہو گئی۔ آٹھ دن ہو گئے تھے گھر کا کھانا خالص ہوا تھا۔ ہوتے میں چینی
اور ستودن کے سوا کچھ ملا ہی تھا۔ کوئی آدمی بدھنی بھر پانی پی گئی۔ اس کے بعد میں
پاؤں پھیلانے شروع۔ خدا جانتے کہتی دیر سوئی۔ کہ نہ کہ اس اندھیری کوٹھی میں
دن رات کی قیصر تو رہی نہ سکتی تھی۔ اس درمیان میں کئی مرتبہ آنکھ کھلی۔ چاروں طرف
اندھیر۔ کوئی آس نہ پاس۔ پھر اور صحن سے تہہ ڈھانچے پڑ رہی۔ پھر نیند آ گئی۔
فیسری جو صحنی مرتبہ آکھ کھلی تو پھر نیند نہ آئی۔ پڑی جا گئی رہی۔ اس نے میں کریم کی ساس
ڈال کی شکل کچھ تر پڑائی انداز کی۔ میں اور تھ بیٹھی۔ لوندہ کھتا سوتی ہے۔ رات کو
پچھنے چیتے کھلا ڈگیا۔ جھنجھڑ جھنجھڑ کے اٹھایا۔ سانس ہی نہ لی۔ میں تو کچھ تھی سانس
سو نہ گیا۔ اسے لودہ تو پھر اور تھ بیٹھی۔ میں چپکے سنا کی۔ جب خوب بک جھک چکی۔
تو پوچھنے لگی۔ وہ پالہ کمان سے میں نے اٹھا دیا۔ وہ بیکرا ہر کھلی۔ کوٹھی
کا دروازہ پھر بند ہو گیا۔ توڑی دیر کے بعد کریم کی جود آئی۔ ادی کوٹھی میں ایک
چھوٹی سی کھڑکی لگی تھی۔ اسے کھول دیا۔ جھکو باہر کھلا۔ ایک ٹوٹا سا کھنڈر تھا۔ یہاں
اس کے آسمان دیکھنا نصیب ہوا۔ توڑی دیر کے بعد پھر ادی کال کوٹھی میں بند کر دی گئی۔
آج اہر کی دال اور جوار کا دلیہ کھانے کو ملا۔

اس طرح اودن گذرے تھے۔ دن ایک اور لڑکی مجھے سن میں دو ایک برس ٹھی
ادی کوٹھی میں تاکے بند کی گئی۔ کریم خدا جانتے کمان سے پھسلا کے لے آیا تھا۔ چار
کسی چپکے چپکے روٹی تھی۔ جھکو آکھانا غنیمت ہو گیا۔ جب وہ روٹو صحنی تو پچھنے

چپکے باتیں ہوا کہیں کسی بیٹے کی لڑکی تھی۔ رام دئی نام غلامینا ہو کے پاس کوئی کھانا
تھا وہاں کی دہنی والی تھی۔

اندھیرے میں تو ادی کی شکل دکھائی دے جی جب صبح مول دوسرے دن کھڑکی کھولی
گئی تو اس نے جھکو دیکھا۔ میں نے اسے دیکھا۔ گوری گوری تھی بہت خوبصورت۔
ناک۔ نقشہ۔ ڈیل ذرا چھرا تھا۔

جو تھے دن اس کال کوٹھی سے ادی کی رانی ہوئی۔ میں وہیں رہی پھر تنائی
نصیب ہوئی۔ دو پہر دن آگئی وہیں رہی۔ تیسرے دن رات کے وقت دلاور دئی
اور پیر پنشن نے مجھے آگے کھالا۔ اپنے ساتھ لے کے چلے۔ چاندنی رات تھی۔ پہلے ایک
میدان سا ملا۔ پھر ایک بازار میں سے ہو کے گذرے۔ پھر ایک پل پر آئے۔ دریا بہر
مارا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں کا پی جاتی تھی۔ توڑی دیر کے بعد پھر ایک
بازار ملا۔ اس سے نکل کے ایک تنگ گلی میں بہت دوڑ تک پہنچا پڑا۔ پاؤں تھک
گئے۔ اس کے بعد ایک اور بازار میں آئے۔ یہاں جری بیٹھیں تھیں۔ اس کے بعد ٹھک سے ملتا
تھا۔ اب ایک کھان کے دروازے پر چھو پہنچے۔

مزار سوا صاحب آپ سمجھے یہ کون سا بازار تھا۔ یہ وہ بازار تھا جہاں میری عزت
کی دوکان تھی۔ یعنی چوک۔ اور یہ وہ مکان تھا جہاں سے ڈاکٹ۔ عزت۔ بدنامی
نیکنامی۔ زردروئی۔ شرخروئی۔ جو کچھ دنیا میں مجھے ملتا تھا۔ ملا۔ یعنی خانہ جان کا
کمان۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ توڑی دیر زینہ تھا۔ زینے پر سے چڑھ کے اوپر گئی۔
کمان کے صحن میں سے ہو کے صدر دروازہ کے دہنی طرف ایک دس سکرے میں خام جان
کے پاس گئی۔

خانہ صاحب کو آپ نے دیکھا ہو گا۔ اس زمانے میں اسکا میں قریب پچاس برس
کے تھا۔ کیا شاندار بڑھیا تھی۔ رنگ تو سا نوا تھا۔ مگر ایسی بھاری بھر کم۔ جامہ زیب
عورت دیکھی نہ سنی۔ بالوں کے آگے کی لٹین بالکل سفید تھیں۔ مگر انھیں پہرے پر
مٹی معلوم ہوتی تھیں۔ لعل کا دوپٹہ سفید کیسا باریک مچھا ہوا۔ کہ شاید دباہ۔ آدھے
مشروع کا پا جامہ۔ بٹے بٹے پانچنے۔ ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے۔
کلاہوں میں چھپے ہوئے۔ کالوں میں سادی دودو استیان۔ لاکھ لاکھ بناؤ دئی تھیں

بسم اللہ کی زنگت آنکھ ناک - نقشہ ہو ہوا دھین کا سا تھا - گردہ نمک کہاں - اس کی صورت خاتم کی مجھے آج تک یاد ہے - پلنگری سے لگی ہوئی قابلیں پر بیچی ہیں - کنول روشن ہے - بڑا سا نقش پانڈان آگے کھلا ہوا رکھا ہے - پچوان پی رہی ہیں - سسٹے ایک ساؤنی سی لڑکی (بسم اللہ جان) نانا ہی ہے - ہمارے جانے کے بعد نانا جوتون ہوا - سب لوگ کمرے سے چلے گئے - معاملہ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا -

خاتم جان - یہی چھو کر رہی ہے؟

دلاور خان - "جی ہاں"۔

مجھے پاس بلایا - چمکا کر کے بٹھایا - اٹھا اور خاک کے صورت دیکھی -

خاتم جان - آجھا پھر جو ہے کہد یا ہے وہ موجود ہے - اور وہ دوسری چھو کر کیا ہوئی؟

پیر بخش - اوسکا تو معاملہ ہو گیا -

خاتم سگتے پر -

پیر بخش - دوسرے پر -

خاتم جان - آجھا خیر - کہاں ہوا -

پیر بخش - "ایک بلکھا جہ نے اپنے صاحبزادے کے واسطے مول لیا ہے" خاتم جان - صورت فضل کی اچھی ہے - اس قدر ہم بھی دے سکتے - مگر تھنے بلدی کی پیر بخش - میں کیا کروں - میں نے تو بہت سمجھا یا - میرے سالے نے نہ مانا - دلاور خان - صورت تو اب کی بھی اچھی ہے آگے آپ کی پسند -

خاتم صاحب - خیر ادا کا بچہ ہے -

دلاور خان - آجھا جو کچھ ہے آپ کے سامنے حاضر ہے -

خاتم صاحب - "آجھا تمہاری ہی ضد ہے" یہ کہہ کے حسینی کو آواز دی - حسینی ایک ساؤنی سی لڑکی اور حیرت سارے آنکھری ہوئی -

خاتم جان - حسینی -

حسینی - خاتم صاحب -

خاتم جان - صند و نمچہ لاؤ -

حسینی لگی صند و نمچہ آئی - خاتم صاحب نے صند و نمچہ کھولا - بہت سے روپیے گن کے دلاور خان کے سامنے ڈھیر کر دیے - (بعد ازاں معلوم ہوا کہ سوا سو روپیے تھے) -

انہیں سے کچھ روپیے پیر بخش نے گن کے اپنے رومال میں باندھے (نشاے کہ چاس روپیے) باقی دلاور خان خروے نے اپنے ڈب میں رکھے - دونوں سلام کر کے رخصت ہوئے - اب کمرے میں خاتم صاحب ہیں - بو آہنی ہیں اور تین ہوں -

خاتم صاحب - (حسینی سے) - حسینی یہ چھو کر رہی ہے داسون کچھ ہنگی تو نہیں معلوم ہوئی - حسینی - ہنگی - میں کہتی ہوں کستی -

خاتم صاحب - کستی بھی نہیں ہے - خیر ہوگا - صورت تو بھولی بھولی ہے - خدا جانے کسی لڑکی سے - ہائے ان باپ کا کیا حال ہوا ہوگا - خدا جانے کہاں سے سوے ہو کر رہے ہیں - فنا بھی خوف خدا نہیں - تو حسینی - ہم لوگ بالکل بے قصور ہیں - عذاب ثواب اور تین ٹوٹوں کی گردن پر ہوتا ہے - مجھے کیا خیر یہاں نہ بکیتی کہیں اور بکیتی -

حسینی - خاتم صاحب یہاں بھرا بھی ہو گیا - آج سے سا نہیں - بیویوں میں لڑکیوں کی کیا آئین ہوتی ہیں -

خاتم صاحب - سنا کیوں نہیں - آئے ابھی اوسدن کا ذکر ہے - سنا تھا سلطان جہان بیگم نے اپنی لڑکی کو کہیں میان سے بات کرتے دیکھ لیا تھا - پنھون سے داغ داغ کے مار ڈالا -

حسینی - دنیا میں جو چاہیں کر لیں - قیامت کے دن ایسی بیویوں کا منہ کالا ہوگا - خاتم صاحب - منہ کالا ہوگا - جہنم کے گندے ڈینگے -

حسینی - خوب ہوگا - بیویوں کی یہی کسر ہے - اس کے بعد بو آہنی نے بڑی منت سے کہا - "بیوی - یہ چھو کر رہی تو مجھے دیر تجھے - میں بالوں - مال آپ کا ہے - خدمت میں کر ڈینگی" -

خاتم صاحب - ٹھیک پالو -

اب تک بو آہنی کھڑی ہوئی - حسینی - اس انگھو کے بعد میرے پاس چھ گھنٹیں مجھے بائیں کرنے لگیں -

حسینی - بھی تو کہاں سے آئی ہے -

مین۔ (درو کے) بچلے سے۔

حسینی (خانہ) بچلے کہاں ہے۔

خانم۔ اے بچو کیا نہیں ہو۔ فیض آباد کو بچلے بھی کہتے ہیں۔

حسینی۔ (مجھ سے) تمہارے ابا کا کیا نام ہے۔

مین۔ جمدار۔

خانم۔ تم بھی غضب کرتی ہو۔ بھلا وہ نام کیا جانے۔ ابھی پھر ہے۔

حسینی۔ اچھا تمہارا نام کیا ہے۔

مین۔ ایس دن۔

خانم صاحب۔ مینی بہ نام تو ہمیں پسند نہیں۔ ہم تو امراؤ کے بچے بنائے گئے۔

حسینی۔ سنا بچی امراؤ کے نام پر تم ہوتا۔ جب یوپی آئین کی امراؤ۔ تم کہنا جی۔

اوس دن سے امراؤ میرا نام ہو گیا پھر وہ دن کے بعد جب مین زلیوں کے شمار میں

آئی۔ لوگ امراؤ جان کہنے لگے۔ خانم صاحبہ مرے دم تک امراؤ کہا لیں۔ جو حسینی امراؤ صاحبہ

کہتی تھیں۔

ایکے بعد دوسری حسینی مجھے اپنی کوٹھری میں لگیں۔ اچھا اچھا کھانا کھلایا۔ مٹھائیاں کھلائیں

مٹھائیاں کھلایا۔ اپنے پاس سلا رکھا۔

آج رات کو مین نے ان باپ کو خواب میں دیکھا۔ جیسے آبا نوکری پر سے آئے ہیں۔

مٹھائی کا دو نہا تھ مین ہے۔ چھوٹا مٹھائی سلتے کھیل رہا ہے۔ اوسکو مٹھائی کی ڈیال میں

بکال کے دیں۔ مجھے پوچھ رہے ہیں۔ جیسے مین دوسرے دالان میں ہوں۔ انان باوچا

مین ہیں۔ اتنے مین آبا کو جو دیکھا دوڑ کے لپٹ گئی۔ درو کے اپنا حال کہہ رہی ہوں۔

خواب میں (زنا روئی)۔ (زنا روئی) کہ چکیاں بندھ گئیں۔ جو حسینی نے ہٹا کر کیا۔ آکھ جو

کھلی کیا دیکھتی ہوں۔ وہ دھک سے نہ دالان۔ آبا مین نہ مان۔ جو حسینی کی کود میں پڑی

رو رہی ہوں۔ جو حسینی آنسو پوچھ رہی ہیں۔ چرلغ روشن تھا مین نے دیکھا کہ جو حسینی

کے آنسو بھی بار بار جاری ہیں۔

و اتنی جو حسینی بڑی نیکذات عورت تھی۔ اوسنے پھر وہ شفقت کی کہ چند ہی روز میں

مین اپنے مان باپ کو بھول گئی۔ اور بھولتی نہ تو کرتی کیا اول تو مجبوری دوسرے نے

سامان سے ڈھنگ۔ نئے رنگ۔ اچھے سے اچھا کھانے کو۔ کھانے وہ جتنے ڈالے

سے بھی مین آگاہ نہ تھی۔ کپڑے وہ جو مین نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے تین

لوکیان۔ بسم اللہ جان۔ غور شید جان۔ امیر جان۔ ساتھ کھیلنے کو۔ دن رات ناچ

گانا۔ چلے۔ تماشے۔ میلے۔ باغون کی سیر۔ وہ کون سا ایسا عیش کا سامان تھا

جو دنیا نہ تھا۔

زرا صاحب آپ کہیں گے کہ مین بڑے کٹر دل کی تھی کہ بہت ہی جلد اپنے ان باپ

کو بھول کر کھیل کود میں پڑ گئی۔ اگرچہ میرا سن بہت کم تھا مگر خانم کے مکان میں آتے

کے ساتھ ہی میرے دل کو آگاہی سی ہو گئی کہ اب مجھے عمر میں غم کرنا ہے۔ جیسے نئی

دولہا اپنی سسرال جا کے سمجھ لیتی ہے کہ مین بہان ایک دو دن کے لیے نہیں۔ بلکہ

مرے اور بھرنے کے لیے آئی ہوں۔ ٹھیک ہی میرا حال تھا۔ راستے میں اون ٹوٹے

ڈکیتوں کے ہاتھ سے وہ ایذا اڑھائی تھی کہ خانم کا مکان میرے لیے بہشت تھا۔ مان باپ

کے لئے کو مین بالکل ناممکن سمجھ چکی تھی۔ اور جو چیز ناممکن سمجھ لجاتی ہے اوسکی آرزو باقی

نہیں رہتی۔ اگرچہ فضل باد لکھنؤ سے صرف چالیس کو س سے گرا اوس زمانے میں مجھے

یہ اتہا دور معلوم ہوتا تھا۔ پچیس کی سمجھ میں اور اب مین بڑا فرق ہوتا ہے۔

اک حال میں انسان کی بس پر نہیں سکتی

اب رنگ طبیعت کا بدل جائے تو اچھا

زرا موصو صاحب۔ خانم کا مکان تو آپ کو یاد ہوگا؟ کس قدر وسیع تھا۔ کتنے کمرے

تھے۔ ان سب میں زلیاں (خانم کی نوچیاں) رہتی تھیں۔ بسم اللہ (خانم کی رکی) خود

میری ہم سنیں تھیں۔ انکی ابھی زلیوں میں گھسی نہ تھی۔ ان کے علاوہ دس گیارہ

ایسی تھیں۔ جو الگ الگ کمروں میں رہتی تھیں۔ ہر ایک کا عملہ جدا تھا۔ ہر ایک کا

دربار علیحدہ ہوتا تھا۔ ایک سے ایک خوبصورت تھی۔ سب گنے پانے سے آراستہ

ہر وقت بنی تھی۔ قولان جوڑے پہنے۔ سادے سادے کپڑے جو ہم لوگ روزمرہ پہنے

ہو تھے۔ وہ اور زلیوں کو عید بقرعہ میں نہیں بھیج دیتے۔ خانم کا مکان کیا تھا ایک شان

میں کمرے میں جا کھڑا ہوا۔ ہنسی غمان بکاتے۔ بجائے کے کوئی اور چرچا تھا۔ اگرچہ
میں کم سن تھی۔ مگر پھر بھی عورت ذات بڑی ہوشیار ہوتی ہے۔ اپنے مطلب کی
سب سمجھتی تھی۔ بسم اظہر خورشید کو لگاتے ملتے دیکھ کے میرے دل میں خود بخود ایک
اشک سی پیدا ہوئی۔ بجائے خود گنگنائے اور پھر کتنے گلی۔ اسی عرصے میں میری بھی
تعلیم شروع ہو گئی۔ میری طبیعت فن موسیقی سے بہت ہی مناسب پائی گئی۔ آواز
بھی بچے لگانے کے لائق تھی۔ سرگم صاف ہونے کے بعد استاد نے آسانی شروع
کرا دی۔ استاد دجی بہت ہی اصول سے تعلیم دیتے تھے۔ ہر ایک راگ کا سرسیرہ
زبانی یاد کرایا جاتا تھا۔ اور وہی گلے سے نکال دیتے تھے۔ بحال نہ تھی کوئی سر کوئل سے
آت کوئل۔ شدہ سے اشدہ یا ترو سے ترو تر ہو جائے۔ اور میری بھی جتنیں کرنے کی
عادت تھی۔ پہلے تو استاد دجی (خدا کو بے ادبھی روح نہ شرمندہ ہو) نالی دیا کرتے تھے
لیکن خانم صاحب کے سامنے میں رام کلی گارہی تھی۔ دھوت سندھ لگا گئی۔ استاد
نے نہ تو لگا۔ خانم صاحب نے پھر اسی کو کہوا یا۔ میں نے پھر اسی طرح کہا۔ استاد دجی
پھر زخمی ہوئے۔ خانم صاحب نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ میں استاد دجی کا منہ
دیکھنے لگی۔ اوغٹوں نے سر جھکا لیا۔ پھر تو خانم نے ادھڑا دے مٹھون لیا۔
خانم۔ بھلا استاد دجی یہ کیا تھا۔ رام کلی میں اوجار دھوت سے ہے اور وہی سر
ٹھیک نہیں۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں۔ دھوت کوئل سے یا شدہ۔
استاد دجی۔ کوئل۔

خانم۔ اور چھو کر نے کیا کہا تھا؟

استاد دجی۔ شدہ۔

خانم۔ پھر آپ نے ٹوکا کون نہیں۔

استاد دجی۔ کچھ مجھے خیال نہیں رہا۔

خانم۔ وہ خیال کیوں نہیں رہا۔ اسی لیے میں نے دوبارہ کہوا یا۔ پھر بھی آپ مرنے
لگے۔ کیا ان بھرے بیچے رہے۔ آپ اسی طرح چھو کر کوئل کو تعلیم دیتے ہیں۔ ابھی کسی
بھدرے کے سامنے اسی طرح کھاتی تو وہ کیا میرے بیچ میں تھوکتا۔

استاد دجی اور سوت تو بہت ہی خفیف ہوتے۔ ٹپ ہو رہے۔ گردل میں بات

لیے رہے۔ استاد دجی اپنے کو ناگ تک سمجھتے تھے۔ اور تھے بھی ایسے ہی۔ اس دن خانم کا
ٹوکنا اور ٹوکنا بہت ناگوار ہوا۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں سو باگاری ہوں۔ خانم بھی موجود ہیں۔ میں استاد
سے پوچھا۔ گندھار اسمین کوئل سے یا ات کوئل۔
استاد دجی۔ ات کوئل۔

خانم۔ خانصاحب ماشاء اللہ۔ یہ میرے سامنے
استاد دجی۔ کیوں۔

خانم۔ اور پھر آپ بھی سے پوچھتے ہیں کیوں۔ سو مائیں گندھارات کوئل سے بھلا
آپ کو کہیے۔

استاد دجی۔ کہنے لگے۔ گندھار کوئل لگا گئے۔

خانم۔ بس آپ ہی قائل ہو جیئے۔ خود آپ کوئل کہیں اور چھو کر کوئل بتائیں۔
یا تو آپ چھو کر کوئل کہتے ہیں۔ یا مجھے کہتے ہیں۔ خانصاحب میں کچھ علانی نہیں۔
خاک چاٹ کے کہتی ہوں۔ گلے سے چاسے نہ ادا ہو۔ مگر ان کا رون نے کیا نہیں سنا۔ میں
بھی ایسے دیکھ کر لڑنے لگا کہ نہیں ہوں۔ میان غلام رسول کو آپ جانتے ہوں گے۔
ان باتوں سے کیا فائدہ۔ اگر تباہ ہو تو دل سے بتائیے نہیں تو معاف کیجیے۔ میں اور کوئل
بند دہشت کر لوں گی۔ چھو کر یوں کو غارت نہ کیجیے۔

استاد دجی۔ بہت خوب۔

یہ کہہ کے اٹھ گئے۔ کئی دن نہیں آئے۔ خانم خود تعلیم دینے لگیں۔ چند دن کے بعد
خلیفہ جی بیج میں پڑے۔ قسما قسمی روکے بلاپ ہو گیا۔ اس دن سے استاد دجی ٹھیک
ٹھیک بتانے لگے۔ بتانے نہ تو کرتے کیا۔ وہ خانم کو اتنا نہ سمجھتے تھے۔ مجھے عمر بھر جرت
رہی کہ خانم زیادہ جانتی ہیں یا استاد دجی۔ کیونکہ بہت سی باتیں جو خانم سے معلوم
ہوئیں استاد دجی ادھڑا دے بتا سکتے تھے۔ یا جان بوجھ کے نہ بتاتے تھے۔ لاکھ قسمی تھمتا
ہو چکی تھی۔ مگر پھر بھی یہ لوگ کرکے باتیں نہیں بتاتے۔ مجھے کچھ ایسا شوق ہو گیا تھا کہ
جان کسی بات میں شک ہوا۔ یا میں سمجھ کر استاد دجی مانتے ہیں۔ استاد دجی کے
جاننے کے بعد خانم صاحب سے پوچھ لیتی تھی۔ وہ بھی میرے اس شوق سے بہت

ہی خوش ہوتی تھیں۔ بسم اللہ کو نعتیان دیا کرتی تھیں۔ بسم اللہ پر بہت محنت
 ہوئی۔ مگر ٹپٹہ ٹپٹہ ٹپٹہ آ یا۔ اس پر بھی نئے سے نالوں تھیں۔ نور شید کی آواز
 اچھی نہ تھی۔ صورت بری کی۔ اور کلا ایسا جیسے پھٹا بانس۔ مان ناچنے میں اچھی
 تھی۔ اور یہی اس نے سیکھا بھی تھا۔ اور کلا بجز صرف ناچ کا ہوتا تھا۔ یوں گالے کو ایک
 آدھ خیر سیدھی سادی کا بھی دیتی تھیں کہ گالے کا نام ہو جائے۔
 خانم کی فوجوں میں بگیا جانے میں نرد تھیں۔ مگر صورت وہ کہ رات کو دیکھو تو ڈیٹا۔
 سیاہ جیسے اونٹن تھا۔ اور سپر چمکے داغ۔ پاؤ بھر قید بھر دو تو سما جائے۔ لال لال
 آنکھیں۔ بھدڑی ناک۔ بیچ میں سے پچھی سوی۔ موٹے موٹے مونڈھے۔ بڑے بڑے دانت
 زبردستہ سے زیادہ۔ اور سپر ٹھنکاقد۔ بوئی نہ سنی کی لوگ چھٹی کتنے تھے۔ مگر قیامت
 کا کلا تھا۔ معلومات بہت اچھی تھی۔ مور چھٹا اور ٹھیک کے گلے سے نکلتے تھے۔ میں جب
 اونکے کمرے میں جا نکلتی۔ ماسے فرمائشوں کے دن کر دیتی تھی۔

میں۔ باجی۔ مان ذرا سرگم تو کہنا۔

بگیا۔ سنو۔ مس رگ تم پ۔ وہ۔ نی۔

میں۔ یہ میں نہیں مانتی۔ سرتیان الگ کر کے بناؤ۔

بگیا۔ لڑکی تو تو بہت شاتی ہے۔ اپنے استاد جی سے نہیں پوچھتی۔

میں۔ اللہ باجی تمہیں بتا دو۔

بگیا۔ س۔ ر۔ گ۔ م۔ پ۔ دہ۔ نی۔ دیکھ بائیں بوئیں
 ۱۲۰ ۱۲۰ ۱۲۰ ۱۲۰ ۱۲۰ ۱۲۰ ۱۲۰

میں۔ (خزات سے) اوہی۔ میں نے نہیں گنین۔ پھر کہو۔

بگیا۔ جا۔ اب نہیں کہتی۔

میں۔ واہ۔ میں تو کہو اسکے چھوڑ دوں گی۔

بگیا۔ پھر وہی کہدیا۔ لے اب نہ سستا۔

میں۔ مان۔ ابھی گنین۔ نکہا دین دوہین نہ؟

بگیا۔ مان دو۔

میں۔ تو ٹھیک بائیں بوئیں۔ آچھا۔ لے اب تنوں گرام کہدو۔

بگیا۔ لے اب ٹپٹے۔ کل آئے گا۔

میں۔ آچھا۔ طنبورہ اور ٹٹا لاؤں۔ کچھ گلاؤ۔

بگیا۔ کیا کا کون؟

میں۔ دھنا سہری۔

بگیا۔ کیا کا کون۔ آستائی۔ دھرب۔ ترانہ؟

میں۔ اللہ باجی دھرب گلاؤ۔

بگیا۔ لے سن۔

تن کی نیت تب ہی مٹے۔ جب پیارے کو درشت بھر دیکھوں گی۔

جب دشمن پاؤں لگی اور نکو تب ہی جی جنم اپنا لیکھوں گی۔

اشٹ جام دھیان موہے واکو رہت ہے رے بھانوں کہن شش بونگی
 جو کر ہو پر بھو پیارے سے ملا دے اسکے پائین میں سیس ٹیکوں گی

خانم جان کی فوجوں کو صرف ناچ گانے کی تعلیم نہیں دیجاتی تھی۔ بلکہ لکھنے پڑھنے کے لکھ
 مکتب بھی تھا۔ مولوی صاحب نوکر تھے۔ حسب دستورین بھی مکتب میں بھیجی گئی۔ مولوی صاحب
 کا لڑائی چہرہ۔ سلید کتر وان داڑھی۔ صوفیانہ لباس۔ ہاتھ میں غدہ عمدہ فیروزے
 اور عقین کی انگوٹھیاں۔ خاک پاک کی تسبیح۔ اوس میں سجدہ گاہ بندھی ہوئی۔ ہر دوئی
 کی جریب۔ چاندی کی شام۔ بہت ہی نفیس ڈبڑھ خمد خمد۔ ایفون کی ڈبیر۔ پالی
 غرضکہ جملہ تبرکات آج تک نظر میں ہیں۔ کیا تھا مذاق تھا۔ دھندار بھی ایسے
 کہ کسی زمانے میں بواجینی سے حسب اتفاق کچھ رسم ہو گیا تھا۔ آج تک اس سے باہر
 جاتے تھے۔ بواجینی بھی اخصین دین دنیا کا خور ہو چھتی تھیں۔ بڑا صا بڑھوں میں اس
 خڑے کی باتیں ہوتی تھیں کہ جو ان کو جو صلہ ہوتا تھا۔ کمان کہیں زید پور کی طرف تھا
 گھر پر ڈاکوئیے گاؤں۔ گراؤں۔ کمان۔ بیوی۔ جوان۔ جوان لڑکے۔ لکھیاں سب
 کچھ موجود تھا۔ مگر خود جب سے لکھنؤ میں تحصیل علم کے لئے تشریف لائے۔ یہیں رہے۔
 شاید ہی دو چار حرمہ گلے ہو گئے۔ اکثر غریب لڑکے کو کہیں چلے آتے تھے۔ گھر سے کبھی کبھی
 دو بیہ بھی آیا کرتا تھا۔ دس روپے خانم صاحب دیتی تھیں۔ یہ سب بواجینی کو ملتا تھا

کھانے۔ پیئے۔ تھہ۔ ایفون۔ کی تاک جو آجینی لیتی تھیں۔ جو بلدا بھی برا جینی تھیں۔
کپڑا برا جینی بڑا دیتی تھیں۔ خانہ صاحب بھی مولوی صاحب کو بہت مانتی تھیں۔
بلکہ مولوی صاحب کی وجہ سے برا جینی کی عزت کرتی تھیں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہے میری پردرکس برا جینی نے اپنے ذمے لی تھی۔ اس لیے مجھے
مولوی صاحب کی توجہ خاص تھی۔ یہ تو میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی کہ مجھے کیا
سمجھتے تھے۔ پاس ادب مانع ہے۔ اور لڑکیوں سے زیادہ مجھے تڑا کید تھی۔ مجھ ابھی کچھ
ناتراش کو اور غنوں نے آدمی بنایا۔ یہ اوغین کی جوتیوں کا صدفہ ہے کہ جس اسیہ
ریش کی مٹھل میں گئی حیثیت سے زیادہ میری عزت ہوئی۔ اوغین کی بدولت
آپ ایسے لائق فائق صاحبوں کے جلسوں میں منہ کھولنے کی اجازت ہوئی۔ شاہی
درباروں میں شرکت کا فخر حاصل کیا۔ اسلئے درجے کی بگیا کے محل میں گھر ہوا۔

مولوی صاحب نے بہت ہی شفقت سے مجھے ڈھایا تھا۔ الف بے ختم ہونے کے بعد
کریا۔ مایمان۔ محمود نامہ۔ صرف روان پڑھا کے۔ ۴۰ نامہ یاد کروادیا۔ اس کے بعد
گلستان شروع کرا دی۔ دو سطرین پڑھاتے تھے۔ سب حفظ کرایا جاتا تھا۔ خصوصاً
اشعار۔ لفظ لفظ کے معنی۔ فقرے فقرے کی ترکیب نوک زبان تھی۔ کچھ پڑھنے پر بھی
محنت لی۔ اہلادست کرایا گیا۔ خط لکھوائے گئے۔ گلستان کے بعد اور کتابیں فارسی
کی پانی ہو گئی تھیں۔ سب اس طرح ہوتا تھا۔ جیسے آموختہ پڑھایا جاتا ہے۔ عربی
کی صرف خواہ دو ایک رسالے منظر کے پڑھے۔ سات آٹھ برس مولوی صاحب کے
پاس پڑھتی رہی۔ شاعری کے شوق کی ابتدا اور انتہا سے آپ خود واقف ہیں اور
بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔

ہم نہیں اونہیں جو پڑھ لیتے ہیں طے کی طرح
مکتب عشق و وفا تجسہ بہ آموز بھی تھا

مکتب میں مجھے سب سے تین لڑکیاں تھیں۔ اور ایک لڑکا تھا۔ گوہرزا۔ جد کا مشیر۔
اور بد ذات۔ سب لڑکیوں کو چھڑا کرنا تھا۔ کسی کا منہ چڑھا دیا۔ کسی کے ٹھکی لے لی

اور کسی جو بی بی کے کچھ لی۔ اس کے کان دکھا دیتے۔ دو لڑکیوں کی جوئی ایک میں بکڑی
بکین قلم کی نوک توڑ ڈالی۔ کہیں کتاب پر دوات اولٹ دی۔ غرض کہ اس کے مارے
ناک میں دم تھا۔ لڑکیاں بھی خوب ہی دھپاتی تھیں۔ اور مولوی صاحب بھی قرار و انہی ہزار
دیتے تھے۔ مگر وہ اپنی آئی سے بانی سے نہ ہو سکتا تھا۔ سب سے بڑھ کے میری کت بنانا
تھا۔ کیونکہ میں سب میں آنٹی اور کبھی سی تھی۔ اور مولوی صاحب کے دباؤ میں بھی رہتی تھی۔
میں نے بھی مولوی صاحب سے کہہ کہہ کے اکثر اڑھائی۔ مگر بے غیرت کسی طرح باز نہ آیا۔ آخر
میں ہی چلیاں کھانے کھانے کا خراگ لگی۔ میری فریاد پر مولوی صاحب اور کو بہت ہی بیدار
سے مزاد دیتے تھے کہ خود مجھے ترس کر جاتا تھا۔

گوہرزا کے اس مکتب میں آنے کا سبب بھی برا جینی تھیں۔

نواب سلطان علی خان ایک بڑے عالیشان خان رئیس تھے۔ توپ دروازے میں رہتے تھے۔
ادن سے اور بڑو دمنی سے دم تھا۔ اوغین سے یہ لکھا پیا ہوا۔ اگر گوہرزا سے اور مولوی صاحب
سے اب ترک ملاقات ہوے مدت گزر گئی تھی۔ مگر دس روپے ماہ ماہ لڑکے کی پردرکس
کے لیے دیے جاتے تھے۔ اور بیکھا جسے چوری چھپے کبھی کبھی بلا کے دیکھ بھی لبا کرتے تھے
تو خامنی کے بلع کی رہنے والی تھی۔ دین برا جینی کے بھائی کا گھر تھا کھڑکی دربان
تھی۔ گوہرزا بھیجے ہی سے ذرات غریب تھے۔ تمام محلے کا ناک میں دم کر رہا تھا۔ کسی کے
گھر میں ڈھیلا پھینک دیا کسی لڑکے کی کٹیا چھین لی کسی کی مرغی کی ٹانگیں توڑ دیں۔
کسی لڑکے سے جو کوؤں کا بچرا دیکھنے کو لکھا اس نے دے دیا۔ آپ نے کھڑکی کی تلی کھڑکی
سب چکرے پڑے اور اگلے غرض کہ طرح طرح کے آزاد دیتے تھے۔ ہزاران نے عاجز ہو کر محلے

کی مسجد میں ایک مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔ یہاں بھی آپ نے اپنے ہتھکڑیے بٹھوئے۔
نام ہم مکتب لڑکوں کو تنگ کرنا شروع کیا۔ اس کے کرتے میں مینڈک چھوڑ دیا۔ اس کی ٹوپی
پھاڑ ڈالی۔ ایک لڑکے کی جوئی اٹھا کے کنوئیں میں ڈال دی۔ ایک دن مولوی صاحب نادر پڑھ
رہے تھے۔ حضرت نے ادا کیا چڑھوان جو تاوض میں تیرا دیا۔ خود بیٹھے سیر دیکھ رہے ہیں۔

اتنے میں کہیں مولوی صاحب ہر پر بھیجے گئے۔ اب تو گوہرزا کی خوب ہی اہمیت ہوئی۔
مولوی صاحب نے اسے ملاخون کے منہ لال کر دیا۔ اور کان پکڑے ہوئے نوکے گھر بڑے گئے۔
دروازے پر سے پار کے کہا۔ مولوی صاحب اپنا لڑکا لاہم لے کر چلے گئے۔ یہ لڑکے مولوی صاحب

تو او دھر گئے گوہر زنا ظلم صورت بنائے روتا ہوا گھر میں آیا۔ اوسوقت افغان سے جو حسینی
بتو سے بیٹھی زمین کر رہی تھیں۔ لڑکے کا جو یہ حال دیکھا۔ آپ کو بہت ہی ترس آیا۔ لڑکے کے
کرنو تن سے تو نگاہ تھیں۔ مولوی صاحب کو بڑا بھلا کہنے لگیں۔

ہوا حسینی۔ ”اے بچے۔ مولوی کا ہے کو تو اتنا حساسی ہے۔ لڑکے کا نہ مامے ملاخون کے بچا دیا۔
آے لو مکان بھی تو ہو کہاں کر دینے۔ تابی بی ایسے مولوی سے کوئی تو چڑھوئے۔ آخر ماما
مولوی صاحب کی تو پڑھاتے ہیں۔ کیسا چنگا رکے دل سے سے پڑھاتے ہیں۔ بتو نے چھوٹے ہی کہا
”بھرو حسینی اسکو بلا سے اپنے مولوی صاحب کی کے پاس لجاؤ۔

ہوا حسینی۔ ”اے تو جاؤن۔ مگر دور بہت ہے۔“
بتو۔ تمہارے بھائی کے ساتھ صبح کو بھجوا دیا کرونگی۔ شام کو بلوا لیا کرونگی۔

ہوا حسینی۔ ”اچھا۔ تو بھجوا دیا کرو۔“

مولوی صاحب سے کچھ پوچھنا تھا۔ اسلئے کہ ہوا حسینی کو اپنی شبن خدمت پر پورا بھروسہ تھا
جاتی تھیں کہ مولوی صاحب اکار تو کر لینگے نہیں۔

دوسرے دن علی بخش (ہوا حسینی کے بھائی کا نام تھا) گوہر زنا کو ساتھ لے کر ٹھکانی کا غول
سر پر رکھے ہوا حسینی کے پاس بھونچے۔ ہوا حسینی نے خوش خوشی ٹھکانی قسیم کی۔ لڑکے کو
مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔

گوہر زنا اب سے زیادہ بھٹی کو شام تھا۔ دن رات داوید اوکاغل رہتا تھا۔ مولوی صاحب
نے اوکو بہت بہت مارا مگر اسنے مجھے تانا نہ چھڑا۔ اسی طرح کئی برس گذر گئے۔ آخر سر
اوسکے صلح ہو گئی۔ بایوں کہے کہ میں اوسکے تانے کی تو کر ہو گئی۔

گوہر زنا کے اوپر سے بن میں کچھ ہی فرق ہوگا۔ شاید وہ مجھے دو ایک سال بڑا ہیں
نمائے کمال لکھ رہی ہوں۔ میلر بن کوئی تیر برس کا ہوگا۔ اور گوہر زنا کو جو دو سال پندرہ
سال تھا۔

گوہر زنا کے تانے سے اب بھگوان آئے لگا تھا۔ اوسکی آواز بہت اچھی تھی۔ ڈوٹی کا لگا تھا۔
قدرتی نے دار بنائے میں مشاق۔ یوٹی بوٹی پھرتی تھی۔ اور حزن کے سر سے آگاہ۔
جب مولوی صاحب کتب میں ہوتے تھے خوب جلتا ہوتا تھا۔ کبھی میں کانٹے لگی وہ بتائے کلا

کبھی وہ گارنا سے بن تال دے رہی ہوں۔ گوہر زنا کی آواز پراوند زندیاں بھی زوریت تھیں۔
ہر ایک کمرے میں بلایا جاتا تھا۔ اوسکے ساتھ میرا بھائی ایک ضروری بات تھی کیونکہ بغیر
میری اوسکی سنگت کے لطف نہ آتا تھا۔

سب سے زیادہ میرا جان اوسکے کان پر غش تھیں۔ مرزا صاحب آپ کو میرا جان بارونگو
رسوا۔ یاد ہیں۔ کہے جاؤ۔

امیر جان کا وہ زمانہ جب وہ منتظر ولد بہادر کی ملازم تھیں۔ اٹھارے جون کے ٹھٹھ
وہ اوسکی بوٹی جوانی۔

کٹنی کھلتی وہ چمبھی زلمت نہ

بھولی بھولی وہ مونس صورت نہ

بانگی بانگی آدائیں ہوش سر با

ترجی ترجی بھگوان ہمسر غذا

ہوٹا سا قد۔ چھریا بدن۔ نازک نازک ہاتھ پاؤں۔

رسوا۔ اب تو میں سے جب اونکو دیکھا ہے۔ آگنی پر ڈالنے کے کان تھیں۔ ایسی بڑی
صورت ہو گئی تھی کہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔

امراؤ۔ کہاں دیکھا تھا۔

رسوا۔ اونہیں گے گھر میں دیکھا تھا۔ جلتے کمرے کے سامنے ایک شاہ صاحب گیر دے کپڑے
پائے زار داتے کی تسبیح ہاتھ میں لیے کھڑے رہتے تھے۔ اوہر سے جو کھلتا تھا اونکو سلام کوٹو
تھے۔ کبھی کسی سے سوال نہیں کرتے تھے۔

امراؤ۔ سمجھ گئی۔ وہ شاہ صاحب اوسکے عاشق بن گئے تھے۔

رسوا۔ جی ہاں۔ کیا میں نہیں جانتا۔

امراؤ۔ اچھا تو اب داین ہتی ہیں۔

رسوا۔ اونکی مصاحبت میں ہیں۔

امراؤ۔ اور اونکا حال کیا ہے۔

رسوا۔ وہ ایک عکیم صاحب پر مرتی ہیں۔

امراؤ۔ کون کا عکیم صاحب؟

امراؤ۔ ندان سے بھی صاف رکھیے۔

اب ہم شہ گلائیں گے اور سکر

یاد آئی تو خیر یاد آئی

رسوا۔ دانش۔ امراؤ جان کیا شعر کہا ہے۔

امراؤ۔ تسلیم

دیکھ کر شہید آدا اذکرو

لالہ وگل کی سیر یاد آئی

رسوا۔ دانش۔ طبیعت زور و نپ ہے۔ کیون ہو۔ عالم شاہ کے ذکر کی یہ شہ

امراؤ۔ جی نہیں۔ شراب کے ذکر کی یہ ناخیر ہے۔

زادہ و آج ہم کو پھر وہ شے

جس سے ہم کو بیز یاد آئی

رسوا۔ انا۔ کیا فائدہ کلا سے۔ اور کہا بھی خوب۔

کبے سے پھر کے ہم ہوئے گمراہ

پھر وہی راہ دیر یاد آئی

امراؤ۔ اے کیا کہنا۔ یہ "کبے سے پھر کے" کیا خوب کہا۔

مزا صاحب اسے مطلع نہ کر دیجیے۔

پھر کے کبے سے سیر یاد آئی

پھر ہمیں راہ دیر یاد آئی

رسوا۔ خاصہ۔

امراؤ۔ روشیں و شش و طیر یاد آئی

و شش و شست کی سیر یاد آئی

رسوا۔ یہ بھی مطلع بڑا نہیں ہے۔

امراؤ۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہم کو نیت العنب سے شکوہ ہے

کیون ہمیں اس نغیر یاد آئی

رسوا۔ میں تو کہتا ہوں کہ طبیعت آج جودت پر ہے۔ اچھا یہ شعر سن لیجئے۔ اب پھر اپنا قصہ دوہرا ناشرہ رو ع کیجئے۔

ہو ابھی ابھی گناہ بھی شراب بھی ہو

یہ سب تو ہو مگر کلا سا وہ شباب بھی ہو

امراؤ۔ واہ مزا صاحب آپ نے تو دل ہی مردہ کر دیا۔ خیر۔ آدم برسر مطلب۔

اسی طرح سے کئی برس میری زندگی کے خانم کے مکان پر گذرے۔ اس درمیان میں کوئی ایسا

واقف نہیں گذرا جس کا بیان ضروری ہو۔

ان خوب یاد آیا۔ بس اس حد کی سبب دھوم دھام سے ہوئی۔ میری آنکھوں کے دیکھنے شاہ

سے لیکر اب تک پھر وہ ویسی سی نہیں ہوئی۔ دھام کی بارہ دری اس جلے کے لیے کچی

گئی تھی۔ اندر سے باہر تک روشنی تھی۔ شہر کی زندگی ان۔ آدم۔ ڈھاری۔ کشمیری۔ بھانڈ

سب فوت تھی۔ دور دور سے ڈیرہ دار طوطا غنیمت بٹائی گئی تھیں۔ بڑے نام کی گونے دلی

تک سے آئے تھے۔ سات دن رات گائے بجانے کی محنت رہی۔ خانم نے جیسا دل کھول گئے

جیسے قسیم کیے ہیں اور کسا آج تک شہر ہے۔ بس احمد۔ خانم کی اکھڑی لڑکی تھی جو کچھ ہوتا تھا۔

نواب جھپن صاحب نے اپنی دادی نواب عمدہ خان خانم کا ورثہ پایا تھا۔ بہت ہی سن

نواب زادہ تھا۔ خانم نے خدا جانے کن تر کیوں سے کیا مارا پچارہ پھینکی تو کیا پھین

فینس اور وہ یہ ذرا صاحب کے اس جلے میں خرچ ہوئے۔ ایک بوجہ احمد ذرا صاحب کی

لازم ہوئیں۔ دم پوشش چاہتے تھے۔

مزار رسوا صاحب جو باتیں آپ مجھے پوچھنے میں اور کھامیری زبان سے کلنا سخت مشکل ہے

یہ سچ ہے کہ زندگی بہت میاں بولی ہیں۔ مگر اس ببا کی ایک لذت خاص ہوتا ہے۔

بن کا تھا صاحب کوئی چیز ہے جو ش جوانی کی وجہ سے جو باتیں اپنی حد سے گذ جاتی ہیں

بن سے اور کرا دھین لپی ضرور ہونا چاہیے۔ تاکہ اعتدال قائم رہے۔ آخر زندگی ان عورت

ذات ہیں۔ ان باتوں کے پوچھنے سے آپ کو کیا فائدہ ہے

رسوا۔ کچھ تو فائدہ ہے جو میں اصرار کر کے پوچھتا ہوں۔ اگر آپ خواندہ نہیں تو آپ کے

سب غرض قابل سماعت ہوتے پڑے لکھن کو ایسی بجا شرم نہیں چاہیے۔

امراؤ۔ ادھی اوجھ پڑھنے لکھنے سے آنکھوں کا پانی ٹھل جاتا ہے۔ یہ آپ نے خوب کہی۔

رسوا۔ آجھا آجھا تو آپ کیلئے فضول باتوں سے میرا وقت نہ ضائع کیجیے۔

امراؤ۔ کہیں کسی اخبار میں نہ چھپا دیجیے گا۔

رسوا۔ اور آپ کیا بھی ہیں؟

امراؤ۔ اے ضیعت! تو یہ کہیے۔ مجھے بھی آپ اپنی طرح رسوا کر نیکیے۔

رسوا۔ خیر اگر یہ ساتھ آپ رسوا ہو گئی تو کوئی ایسی قیامت نہیں ہے۔

رسوا سے کہوں لے ہو محبت جنا کے تم۔

چھوڑ دیکھا اب نہ میں تمہیں رسوا کیے بغیر۔

امراؤ۔ توج۔ آپ سے کوئی محبت کرے۔

راہ سے گفتگو کو مباحص سے بحث ہو

بقی نہیں ہے ذکر کسی کا کیے نہیں۔

رسوا۔ کیسے شہر ہے؟

امراؤ۔ یہ آپ مجھے کون پوچھا کرتے ہیں۔

رسوا۔ مان سمجھا۔ تو یہ کہیے آپ نے بھی یہ غزل سنی ہے۔

امراؤ۔ جاتے ہیں جان بیچ کے بازار عشق میں

ہم آئیں گے نہ حسن کا سودا کیے نہیں۔

رسوا۔ اور وہ شعر یاد ہے۔ تقاضا کیے بغیر۔

امراؤ۔ وعدہ ہوا کہ قول وہ ایسے میں نادہند

مناہیں کچھ اون سے تقاضا کیے نہیں۔

رسوا۔ اور کوئی شعر یاد ہے۔

امراؤ۔ اور کوئی یاد نہیں آتا۔

رسوا۔ یہ تو بہت بڑی غزل تھی۔ دیکھنا کہیں نقل پڑی ہو تو مجھے دکھانا۔

امراؤ۔ ادھین سے نہ منگواؤ۔

رسوا۔ خود جا کے لکھ لاؤں تو ممکن ہے۔ وہ تو ہرگز نہ کہیں گے۔

امراؤ۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔

رسوا۔ جی مان۔ آپ کو نہیں معلوم۔ مسودے کے سوا غزل مان کرنے تک کی قسم ہے

امراؤ۔ آجھا۔ ایک دن ہم آپ دو دن جلیں۔ مان ایک شعر یاد کیا۔

ہر چند کہ میں آپ ہی بدنام کون ہوں

باز آئیں گے نہ وہ مرا چر چا کیے نہیں۔

اور کہیے۔

غیر دن کو ہے ستم کے تقاضے کا حوصلہ

چھوڑینگے یہ نہ عشق کو رسوا کیے نہیں۔

رسوا۔ میری بھی غزل اسی طرح من تھی۔ مگر خدا جانے کیا ہوئی صرف وہ قطع یاد ہو گیا تھا

امراؤ۔ قطع پھر نہ کیے کیا خوب کہا ہے۔

رسوا سے کہوں لے ہو محبت جنا کے تم

چھوڑ دیکھا اب نہ میں تمہیں رسوا کیے بغیر

امراؤ۔ واقعی خوب کہا ہے مگر اس میں آپ کے تخلص نے خاص لطف دیا۔

رسوا۔ تخلص کا ذکر نہ کیجیے۔ ایک غایت فرما کی غایت سے شہر میں اب کئی رسوا موجود ہیں۔

اگ خواہ خواہ اپنے آپ سے خاصے تخلص چھوڑ کے رسوا ہوئے۔ مانے ہیں۔۔۔ وہ تو کیے

میرا نام نہیں جانتے نہیں تو کیا عجب ہے کہ نام بھی بدل ڈالیں۔ گو میں تو خوش ہوں

ایسے کہ انگریزی ہم کے موافق باپ بیٹوں کا نام ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ سبیر سے دو جاتی

غذائے میں جس قدر نسل تہی کر گئی میرا نام روشن ہو گا۔

رسوا۔ لے اب مان لے نہ جو کچھ میں نے پوچھا ہے وہ تو کتنا ہی بڑے گا۔

امراؤ۔ کیا بد دوستی ہے۔ کیا بے خیری کی باتیں آپ پوچھتے ہیں؟

رسوا۔ بیاہ برا توں میں گالیان کاتے سے زیادہ بے خیری ہوگی۔

امراؤ۔ آپ کے لکھی میں تو زندیاں گالیان نہیں کاتیں۔ ڈو میناں الہیہ پہناتی ہیں۔

وہ بھی عورتوں میں۔ وہ بات میں زندیوں کو کانا پڑتی ہیں مردوں میں۔ نامی مردانہ

شہر ہوا دیہات۔ یہ رسم تو کچھ اچھا نہیں ہے۔

رسوا۔ آپ کے کہنے سے اچھا نہیں ہے۔ میری اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے اور

ان کا توں سے سنا ہے آپ کے اچھے شریف مرد آدمی عورتوں میں گھس کے شوقیہ گالیان

سنے ہیں۔ انہیں بھی جا رہی ہیں۔ اور یہ خوش ہیں۔ پچھین کھلی جاتی ہیں۔
آج خدا نے یہ دن دکھایا۔ کاش شب ماہ دن دکھاتا۔ اس کے علاوہ رات کی رات بھر
اور صبح کی جو ہر دو گیارہ باعصمت ہو بیرون میں ہوتی ہیں۔ اس کا ذکر بھی بخش سے خالی نہیں
چوتھی کی شام کو جو جینکا کشتی اکشر نامحرم مرد اور بے باک عورتوں میں ہوتی ہے اس کا
ذکر کیا خیر ان باتوں کو رہنے دیجیے۔ اپنی تہی کیے۔ ہم کوئی صلح قوم نہیں جو ان
باتوں پر کشتہ چینی کریں۔
اعراؤ۔ آپ نہ مانے گا۔ لے بنے۔

جب سے ہم اشد کی سہی ہوئی اور خورشید جان اور امیر جان کے کارخانے دیکھے ہیں
بل میں ایک خاص قسم کی آنکھ پیدا ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک خاص قسم۔ جس سے میں انک
تا واقعہ تھی۔ کے اور ہونے کے بعد ہم اشد جان اور خورشید سے خورشید جان
ہو گئیں۔ بے باکی کی سند حاصل ہو گئی۔ آزادی کا خلعت مل گیا۔ اب لوگ مجھے ملاحظہ سے
ہو گئے۔ میں ان کی نگاہوں میں حقیر سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مردوں کے ساتھ بے کلفت
ہنسی مذاق کرنے لگی تھیں۔ ان کے کمرے بجا بجا دیے گئے تھے۔ ڈاک کے پتنگ
وڈیوں سے کسے ہوئے۔ فرسٹ کلاس سہری چاندنی لکھنی ہوئی۔ بڑے بڑے فحشی پانڈان
مغابہ۔ حسن دان۔ خاص دان۔ اوگالڈان۔ اپنے اپنے خربوٹوں سے رکھے ہوئے۔ دو دروں
پر چلتی آئے۔ عمدہ عمدہ تصویریں۔ چھت میں چھت کمریاں لگی ہوئیں۔ جس کے دریاں
ایک مختصر سا جھاڑ۔ ادھر ادھر عمدہ ٹانڈیاں۔ سرشام سے دو کنزل روشن۔ ہو جاتے
ہیں۔ درود ہریان۔ درود خد ہیکار۔ ماٹھ باندھے کھڑے ہیں۔ خوبصورت۔ زوجان
ریشم اور ہر وقت دل بہلانے کو حاضر۔ چاندنی کی ٹوٹری ٹنڈ سے لگی ہوئی ہے۔
سانے پانڈان ٹھلا ہوا ہے۔ ایک ایک کو بان لگا کے دچی جاتی ہیں۔ پہلیں ہوتی جاتی
ہیں۔ اوشتی ہیں تو لوگ بسم اشد تھے ہیں۔ چلتی ہیں تو لوگ آنکھیں پچھائے دیتے ہیں
میں کہ کسی کی پردہ ہی نہیں کڑیل۔ جو ہے انھیں کے حکم کا تابع ہے۔ حکومت بھی وہ کہ
زمین آسمان بلجائے انکا کہنا ملے۔ فرایٹون کا تو ذکر کیا۔ بن مانگے لوگ کھینے کا
کمال کے دے دیتے ہیں۔ کوئی دل پہلی پر رکھے ہوئے ہے۔ کوئی جان قربان کرتا ہے
میاں کسی کی خد ہی نہیں قبول ہوتی۔ کوئی بات نظر میں نہیں سمجھتی۔ بے پردہائی یہ کہ

کوئی جان بھی دے دے تو ان کے نزدیک کوئی مال نہیں۔ غور کیا کہ نہت ظلم کی
سلطنت انکی شوکر ہے۔ نازدہ جو کسی سے اٹھایا بٹھائے۔ مگر اٹھانے والے اور کھانے
ہیں۔ نازدہ جو ماہی ڈالے۔ مگر مرنے والے مر جاتے ہیں۔ ادھر اسکو روک دیا۔
ادھر اسے ہٹا دیا۔ کسی کے کھینے میں ٹپکی لے لی۔ کسی کا دل تلون سے مل ڈالا۔
بات بات میں روشنی جاتی ہیں۔ لوگ مارے ہیں۔ کوئی ماٹھ چڑھا ہے۔ کوئی
رشتہ کر رہا ہے۔ قول کیا اور مار گئیں۔ قسم کھائی اور بھول گئیں۔ بھل بھرن سکی
انکا ہانچی طرف سے۔ یہ آنکھ اور ٹھاکے بھی نہیں دیکھتیں۔ بھر جہد دیکھ لیا ادھر
سب دیکھنے لگے۔ جس پر انکی نگاہ پڑتی ہے اور سپر نارون لگا ہیں پڑتی ہیں۔ رنگ
کے مارے لوگ جلے جاتے ہیں۔ یہ اور جان جان کے جلا رہی ہیں۔ اور لطف یہ کہ
دل میں کچھ بھی نہیں وہ بھی پیچ پیچ بھی ہے۔ نقطہ نادر۔ اگر وہ بچارہ ان کو
میں آ گیا پھر کیا تھا پہلے بظاہر خود مرنے لگیں۔ آج کل ان کو بہت ہے عریضہ
منظر پر یا مری یا مرے دشمن کی قضا آتی ہے دشمن ان کے دشمن۔ آخر وہی کو مارا۔
اب جا کے کچھ میں ٹھنک پڑی۔ اس غریب کے گھر میں روٹا پٹنا پڑا ہے۔ یہ بھی
یاروں کے ساتھ تھپے لگا رہی ہیں۔

مذا صاحب ان سب باتوں کو آپ مجھے سہرا جانتے ہیں۔ اور بیان کر سکتے ہیں۔
مگر یہ کشتے دیکھ دیکھ کے میرے دل پر جو گندنی تھی اسکو میں ہی خوب جانتی ہوں۔
عورت کو عورت سے جو رشک ہوتا ہے اسکی کچھ انتہا نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے۔ اگر
مجھے کہتے جو ہے غم آتی ہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ سب کے چاہنے والے بھی کو
چاہیں۔ اور سب کے مرنے والے بھی ہر مرین۔ نہ کسی کی طرف نہ آنکھ اور ٹھاکے
نہ کسی پر جان دین۔ مگر میری طرف کوئی آنکھ اور ٹھاکے بھی نہ دیکھتا تھا۔ بواہی کی کوئی
جسکے دو دروں سے لیکر چھت تک دھوئیں سے سیاہ تھی۔ اس کے ایک طرف جھانک پتنگ
پڑا ہوا تھا اور ہم اور بواہی دو دن رات کو پڑے تھے۔ ایک طرف اس کو ٹھری
میں جو بٹھانا ہوا تھا اس کے پاس دو گھرے رکھے ہوئے تھے۔ یہیں دو بھلی سی بتلیاں
گلن۔ تو۔ رکایاں۔ پالے۔ ادھر ادھر چڑے رہتے تھے۔ ایک کونے میں آٹے
کی کھلی رکھی رہتی تھی۔ اس کے اوپر دو تین دالین۔ لک بھالہ۔ ماٹھ پٹن۔ اسی کی

جلائے کی لکڑیاں بونٹے۔ مصالحوں کے کیل بہتہ۔ خلاصہ یہ کہ تمام کرکری خانہ بہین
تھا۔ چرلے کے اور دیوار میں دو کیا میں لگی تھیں۔ کھانا پکانے دھت اکسپر چرلے
رکھ دیا جاتا تھا۔ اور ایک چمک ہوا چھوٹا سا ڈیوٹ ہلنگ کے پاس دھرا رہا تھا۔
کھانا پکانے کے بعد وہی چرلے اکسپر رکھ دیا جاتا تھا۔ چرلے میں پتلی ٹوٹ سی جی
پڑی ہوئی اندھا اندھا چل رہا ہے۔ لاکھ اوکساؤ۔ کوڑا پچی نہیں ہوتی۔ اس کوٹھری
کی آرائشوں میں دو چھینکے لگی تھے۔ انہیں سے ایک میں باز رہتی تھی۔ اور دوسرے
میں سالن۔ دال کی پتلی۔ چائیاں مولو یصاحب کے واسطے ڈھانک کے رکھ دی
جاتی تھیں۔ پیادو والا چھینکا تو چرلے کے قریب تھا اور یہ دوسرا میرے سینے پر تھا۔
جسکے وجہ سے کھانا گویا میرے سینے پر دھرا رہا تھا۔ اگر پٹنگ برا جاتا تو کھانا کھڑی
نوسال کی پتلی کھٹ سے ستر میں لگی۔ صبح سے دس گیارہ بجے تک مولو یصاحب کی
چھیاں۔ اندر نام سے فونجے تک اور سادگی کی جھڑکیاں اور سادگی کے کروں کی
مار۔ یہ ہمارا خلاص بیار تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر میں اپنے کرتوتوں سے باز نہ آتی تھی
اول اول فونجے آئندہ دیکھنے کا شوق ہوا۔ اب میرا سن چودہ برس کا تھا۔
اور مولو جیسی کوٹھری سے ٹلین اور دھرمین نے اونچی چاری سے آئندہ نکالا۔ اپنی
صورت دیکھنے لگی۔ اپنا ناک نقشہ۔ اور رنڈیوں سے لائی تھی۔ مجھے اپنے چہرے
بھرمین کوئی چیز بڑی نہ معلوم ہوتی تھی بلکہ اردن سے اپنے کو بہتر سمجھتی تھی اگرچہ
درحقیقت ایسا نہ تھا۔

رسوا۔ نوکیا آپ کی صورت کسی سے بڑی تھی۔ اب سیکڑوں میں آجھی ہو۔ اوتو
نواور بھی جو بن ہوگا۔

امراؤ۔ سلیم۔ خیر۔ اب اس تعریف کو رہنے دیجئے۔ بالکل بے محل اور بے موقع ہے۔
مات کیجئے گا۔ مگر ان اوتو وقت میرا ایسا ہی خیال تھا۔ اور یہ خیال میری جان کے
لیے آفت تھا۔ میں دل ہی دل میں کہتی تھی اسے مجھ میں کیا برائی ہے جو کوئی میری
طرف توجہ نہیں کرتا۔

رسوا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کسی کو آپ کی طرف توجہ نہ ہو۔ بھلا میں ضرور پڑتی ہو گئی۔ مگر بات
یہ تھی کہ آپ کی سہیلی نہیں ہوتی تھی۔ خانم سے لوگ ڈرتے تھے ایسے آپ سے کوئی نہ بولتا۔

احراؤ۔ شاہی ہو۔ مگر مجھے اتنی تہذیب نہ تھی۔ میری تو وہ نسل تھی۔ بی بی دلی
اپنے نیچے میں آپ ہی کہتی تھی، اپنی بھولوں کو دیکھ دیکھ کے پھٹکی جاتی تھی۔ کھانا پنا
حسہ ام تھا۔ راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔

اوی راتے میں چہرنگھی چو کی کاٹون ہوا۔ گنگھی کرتے وقت اور بھی صدمہ ہوتا تھا۔
ایسے کہ کوئی چو کی کاٹون نہ دلائے تھا۔ جب بسم اللہ کی چو کی ڈاب چھین صاحب
اپنے ہاتھ سے گوندھتے تھے میرے سینے پر سائب لٹ جاتا تھا۔ یہاں کن تھا۔ وہی
لو جیسی۔ وہ بھی جب اویضین فرصت ہوئی۔ نہیں تو دن دن بھر بال کھتے ہیں۔
سر جھاڑ۔ منہ پہاڑ۔ بھر ہی ہوں۔ آخر میں نے اپنے ہاتھ سے چو کی گوندھنا سکھا۔
اور کوسب زبانیان دن بھر میں تین تین جوڑ بدلتی تھیں۔ یہاں وہی آٹھ دن دن۔ پوشا
بھی بھاری نہ تھی۔ وہ لوگ کار جو لی جوٹے پہنتے تھے۔ یہاں وہی گلابن کا پا جا۔
ملل کا دوپٹہ۔ بڑی بڑائی ہوئی کچکے کی تیلی دے دیتی۔

ابہر بھی کپڑے بدل کے میرا جی چاہتا تھا مردوں میں جا کے بیٹھوں۔ کبھی بسم اللہ کے
کمرے میں چلی گئی۔ کبھی امیر جان کے پاس۔ مگر وہاں جاتی تھی کسی نہ کسی بہانے
اور ٹھانڈا دیا جاتی تھی۔ ان لوگوں کو میرا بیٹھنا ناگوار تھا۔ سب کو اپنی اپنی مزیدار بون کا
خیال تھا۔ مجھے کون بیٹھنے دینا تھا۔

اور یہ بیٹھنے دینے کا ایک اور بھی سبب تھا کہ اون دنوں میری طبیعت میں کفر
شرارت مہمائی تھی۔ جہاں بیٹھتی کسی کو ٹھیک لگا دکھا دیا۔ کسی کا منہ چڑھا دیا۔ کسی کے
پٹکی لے لی۔ ہر طبع مردوں سے گلا دھڑکاتی تھی۔ اس وجہ سے لوگ میرے
بیٹھنے کے روادار نہ تھے۔

مرزا صاحب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ گوہر مرزا ایسے وقت اور اس حالت میں مجھے
کس قدر غنیمت معلوم ہونا تھا۔ ایسے کہ وہ مجھے پیار کی باتیں کرنا تھا۔ میں اوکو
چھڑتی تھی وہ مجھ کو چھپڑتا تھا۔ میں اوی کو اپنا جاننے والا سمجھتی تھی۔ اور وہ بھی
اون دنوں بھگو جاتا تھا۔ جب صبح کو کتب میں آنا۔ کہیں دو نازنگیاں جب میں پی
این۔ مجھے چپکے سے دیدیں۔ کسی دن حواس میں کی تکیہ لینا آیا۔ بھگو بھلا دی۔ ایک دن
نہیں معلوم کہاں سے ایک روپیہ لایا تھا۔ وہ بھی مجھے حوالے کر دیا۔ ہزاروں روپے پینے

اپنی زندگی میں اپنے ہاتھ سے اودھائے ہون گے مگر اوس ایک روپے کے پائے کی خوشی کبھی نہ بھولوں گی۔ اس کے پہلے مجھے بے ذہنت ملے تھے۔ مگر وہ یہ کبھی نہ لگتا۔ وہ روپہ بہت دن تک میں نے منجھو رکھا۔ اس لیے کہ اوس کے صرف کی کوئی ضرورت مجھے نہ تھی۔ اور اگر خفیہ ہی تو یہ خیال تھا کہ اگر اسے صرف کرنی ہون تو لوگ پوچھیں گے کہان سے ملا تو کیا بناؤں گی۔ رازداری کی کچھ مجھے بھی لگتی تھی۔ اور یہ سمجھ لیں کہ میں قیصر کو بھونپے نہیں آتی۔ بیشک میں بن نیز کو بھونچ چکی تھی۔

ایک شاطر چور دل میرا چرا کر لے گیا۔ پاسان کی بخت سب سوتے کے سوتے رہ گئے

برسات کے دن میں آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ پانی تل دھارا اور دھارا برس رہا ہے۔ بجلی چمک رہی ہے۔ بادل گرج رہا ہے۔ میں لوہیسی کی کوٹھری میں اکیلی بیٹھی ہوں۔ بوہیسی خانم صاحب کے ساتھ جداری کے گھر گئی ہوئی ہیں۔ چرل گل ہو گیا ہے۔ اندھیری وہ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سو جھتا۔

اور کمرہ میں جین پور سے جین کپڑے سے گانے کی آواز آرہی ہے کہ کہیں تھپتھپ اور ہے میں۔ ایک میں ہوں کہ اب اندھیری کوٹھری میں اپنی تنہائی پر رو رہی ہوں۔ کوئی آس پاس نہیں ہے۔ دل پر جو گدڑ رہی ہے دل ہی جانتا ہے۔ جب بجلی چمکتی ہے اس کے ڈر کے دولائی سے منہ ڈھانپ لیتی ہوں۔ جب گرج کی آواز آتی ہے کاؤنٹیاں اوٹھلیاں دے لیتی ہوں۔ اسی عالم میں آنکھ لگ گئی۔ اسے میں یہ معلوم ہوا۔ جیسے کسی نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میری انگلی بندہ گئی۔ منہ سے آواز نہ نکلی۔ آخر یہ خوش ہو گئی۔

صبح کو چور کی ڈھونڈ صبا ہوئی۔ وہ کہان لیتا ہے۔ خانم منہ غور تھا ہے میٹھی بن۔ بوہیسی بڑھاتی پھرتی ہیں۔ میں ٹھک اری سی چمکی چمکی ہوں۔ سب پوچھ پوچھ کے ٹھک گئے مگر مجھے کچھ معلوم ہو تو بتاؤں۔
رسوا۔ یہ نہیں کہتیں کہ اگر معلوم بھی ہو تو کیوں بتاؤں؟

اعراؤ۔ خیر اب حاشیے نہ پڑھائیے۔ سستے جائے۔
خانم کی اوس دن کی بابوسی اور بوہیسی کا اوداس چہرہ اب جب مجھے یاد آتا ہے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔
رسوا۔ کیوں نہ ہنسی آئے۔ اوبکی نوساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اور آپ کا مذاق ہو گیا۔

اعراؤ۔ امیدیں خاک میں مل گئیں! خانم کو آپ نہیں جانتے۔ ایک ہی لکڑی میں اس معاملے کو اس طرح دبا دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ اور انتقام کی دھندہ پیرن کین کہنا دبا۔ اب کسی آنکھ کے اندر سے اٹکا ٹھکے دور سے کی تلاش ہوئی۔ آخر ایک پوچھنے ہی گیا۔ اول دنوں ملک کے بن سے ایک۔ صدر افسد وہ کہ صاحبزادے طالب علمی کے لیے لکھنؤ میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ گھر سے خوش۔ والدہ خرم ان کے رفعت۔ خداداد کے روپے سے ایک بہت بڑا علاقہ انکھ میں بچا کے لیے خرید کر کے چھوڑ گئے تھے۔ چند روز یہاں آکر آچھے رہے۔ پھر جو لکھنؤ ہوا لگی۔ خانم شہیسی میں طاق اور دن بے غیرتی میں نشان ہو گئے۔ ہم شریف راشد علی تھا۔ راشد تخلص کرتے۔ لکھنؤ کے کسی اوسٹار نے مرشد بنا دیا۔ اس تخلص پر آپ کو بہت ہی فخر تھا۔

وطن سے جو ملازم ہمراہ آئے تھے وہ سب رخصت میاں کہتے تھے۔ لکھنؤ والوں نے انکو ماہر کا لقب دیا۔ مگر اس نام اور القاب میں کسی قدر دہانت تھی۔ اور آپ لکھنؤ کی وضع طرح پر مڑتے تھے۔ اس لیے قہور سے ہی دنوں میں ذوالصاحب بن گئے۔ جب گھر آئے تھے تو خامی داڑھی منہ برقی۔ لکھنؤ کی ہوا لگنے ہی پہلے کڑواں ہوئی پھر خوشامی۔ اور قہور سے دنوں کے بعد بالکل صفا ہوا گیا۔ داڑھی منہ سے بچوٹا سا چڑ کیا۔ بد مذاکل آیا۔ مگر آپ اوسے خوبصورتی سمجھتے تھے۔ ساہ رنگت۔ چمک کے دان۔ ہندی سی ناک۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ کمال پنجے پر سے تنگ پشانی۔ کوتاہ گردن۔ ٹھکانا تھنہ غرض کہ ہر صفت بھصوت تھے۔ مگر آپ اپنے کو بھصوت ثانی سمجھتے تھے۔ بہرہ ان آئندہ سامنے رہتا تھا۔ موچھن میں اس قدر مڑی گئیں کہ آخر جو بیا کی دم ہو گئیں۔ بال بڑھائے گئے۔ گھونگھڑیا گیا۔ نئے دارو پنی سر پر رکھی گئی۔ اوبھی چولی کا انکرہ ڈھانپا۔ جسے بانٹھون کا باجامہ پہنا گیا۔ یہ سب خانقاہ رشیدیوں کی دربارداری کے لیے کیا گیا تھا۔

اول تو خود ہی طبیعت بہت رسا تھی۔ دوسرے لائق احباب کی وساطت چند ہی روز کے بعد اونچے اونچے کمرون پر رسائی ہو گئی۔ رسائی کبھی بے کلفی بڑھ گئی۔ بھٹائی جان سے مادر پدر ہوتا ہے۔ لیکن تمہیں لگائی ہیں۔ حشمتانے جو تاج پہنچا دیا۔ آپ میں کبھی ٹھٹی نہیں رہے ہیں۔ یہ سب کچھ تھا مگر انکاؤن کا بڑا ادب کرتے۔ جس زندگی سے ایک شب کے لیے بھی واسطہ ہو گیا تھا اسکی ناکا کو مجمع عام میں امان جان کہنا اور بھلا کے تسلیم کرنا عین سداقہ مندی تھی۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ بارون پر ظاہر ہو جاتا تھا کہ آپ بہان مشرف ہو چکے ہیں۔

مر شام سے دس بج گھڑی رات گئے تک خانم صاحب کا دربار کرتے تھے۔ انکی ہر ایک فریج کی خدمت میں نیاز تھا۔ علم موسیقی میں بھی آپ کو کمال تھا۔ ٹھریاں خود تصنیف فرماتے۔ خود ہی دھن بنا کے گاتے تھے۔ خود ہی بھاؤ بتاتے جاتے تھے۔ اور تو جو کچھ تھا وہ تمام سے طلب خوب بجاتے تھے۔ بارون نے خوب ہی بنا بنا لیا تھا۔ آپ کے اشارہ پر لوگوں نے اتنی تعریف کی کہ آپ کو غرناخ و دانش بنادیا۔ مشاعرہ دین ڈوریا لکھنے آپ سے غزل بڑھوا لی۔ تمام مشاعرہ چونک گیا۔ ریختی گویوں سے پہلے آپ کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ جسے سننے والے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ لوگ بناتے تھے۔ آپ خوش ہوتے تھے۔ ٹھک ٹھک کے نعلینیں کرتے تھے۔

وطن سے بے غل و غش روپیہ چلا آنا تھا۔ انکی والدہ بھاری اس خیال سے کہ کڑکا پڑے گیا ہے۔ مولوی بن کے آئے گا۔ جو یہ لکھ بھیجتے تھے بھیج دیجی نہیں۔ لکھو کے بھگے۔ خوش ہونا کہ۔ عیش پسند۔ مختلف خورے۔ آپ کے ہمراہ رہتے تھے۔ ان میں لوگوں کے کہنے سے کچھ خیال پیدا ہوا۔ اس خیال نے قری کر کے اشتیاق تک نوبت ہو جاتا تھا۔ آخر کو مشق اور اسکے بعد جنون ہو گیا۔ ادھر خانم نے کھنکھایا۔ خانم کا یہ کہنا۔ انا صاحبہ ابھی وہ کم سن ہے۔ اور انکی انتہا۔ منت ذرا رہی۔ بھڑائی۔ آج تک مجھے یاد ہے۔ آخر دعا۔ قویہ کی تاثیر اور غمخواروں کی درد او شش سے بانجھار رو پیہ پڑو ہوا۔ اس رو پیہ کے لینے کے لیے آپ کو چند روز کے لیے وطن جانا پڑا۔ مان سے چھپا کے روکاؤن آپ نے نہیں کر دیے۔ میں ہمیں ہزار روپیہ لے کے لکھنے آئے۔ بانجھ توڑے۔ رگن دیے۔

روپیہ عین المال دیوان جی کی محض خانم کے خزانہ عامہ میں داخل ہوا۔ بواہی سے پاؤں چھیلے۔ بانسو نذر یاد کے نام سے یہ لے مرین۔ خلاصہ یہ کہ میں آج کے میر منڈھی گئی۔ چھ مہینے تک آپ اور لکھنؤ میں رہے۔ سو روپیہ ماہوار دے تھے۔ فرزند کا دل نہیں۔ جو کچھ نصیب مجھے دیا وہ بواہی کے پاس رہنا تھا۔ خانم کو اسکی خبر نہ تھی۔ اب میں گویا آزاد ہو گئی۔ دو ہریان۔ دو خدنگار۔ میرے لیے خاص ملازم ہوئے۔ بھانک کے پاس والا کمرہ میرے رہنے کے لیے سوچ دیا گیا۔ دو چار مرد آدمی شریف راز۔ ذرا ب زادے میرے پاس بھی آ کے بیٹھنے لگے۔

کلیچ میں اول گوہر مرزا مجھے ہر زمانے میں رابر ملتا رہا۔ خانم اور بواہی اسکی صحبت سے جاتی تھیں۔ مجھے محبت تھی اس لیے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ ادھر گوہر مرزا کے والد نے انتقال کیا۔ جو آمدنی دہان سے تھی وہ بند ہو گئی۔ بڑ بڑھیا ہو چکی تھیں۔ کوئی بوچھا نہ تھا۔ اس لیے گوہر مرزا کی صحبت کی خبر گیری میرے ہی ذمے تھی۔

سب ریڈیوں کا قاعدہ ہے ایک نہ ایک کو اپنا بنا رکھتی ہیں۔ ایسے شخص سے بہت فائدہ ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب کوئی نہ ہوا۔ اسی سے دل بہلایا۔ سوئے شلوت کا آرام رہتا ہے۔ آدمی سے ٹکاؤ تو کچھ نہ کچھ کھا جائے گا۔ یہ مارے خیر خواہی کے اچھی کا اچھی چیز شہر بھر سے ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ بیمار بڑو تو حد سے زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ طرح طرح کی آرام دیتے ہیں۔ رات بھر پاؤں دباتے ہیں۔ صبح کو دو ابنا کے لاتے ہیں۔ یک صاحب سے حال کہنے جاتے ہیں۔ دوست کو شتاؤن میں تو غریبین کرتے رہتے ہیں۔ چرکٹ پھنک لاتے ہیں۔ جہاں کہیں شادی بیاہ ہوا۔ نائی کا نظام اپنے ذمے لے کے محرمین میں انھیں کو لیجانے ہیں۔ محفل میں میٹھکر ابل مٹھل کو توجہ کرتے ہیں۔ وہ نالاج رہی ہے۔ یہ نال دیتے جاتے ہیں۔ ہر شے پر کہتے ہیں۔ ہر نال پر وہاں کر رہے ہیں۔ وہ بھلاؤ بنا رہی ہیں یہ شہر کر کے جاتے ہیں۔ انھیں کی وجہ سے اچھے سے آچھا کھانے کو ملتا ہے۔ خاطر مدارات اور نظیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ ابنا آکر سوا ملتا ہے۔ اگر کسی امیر رئیس سے ملاقات ہو گئی۔ انھیں کی مدد و دولت اسکو لطف و نفاہت حاصل ہوتا ہے۔ ادھر وہ جاہتے ہیں کہ زبڑی ہکا پھکا بنے لگے۔ ادھر زبڑی جان جان کے کھا کلمہ بھر رہی ہے۔ کبھی یہ غور ہے۔ صاحبین انکی باہنہ ہون نہیں معلوم

آپ سے کیونکر ملتی ہوں۔ آپ اونکے آئے کا وقت ہے مجھے جانے دیجیے۔ وہ ہمیشہ کے ہیں۔ آپ اس طرح کیا بنا بیٹھے گا۔

تمناشیں ان سے دبتے رہتے ہیں۔ اگر کسی سے کچھ تکرار ہوئی یہ حمایت کو مستعد نہ کرے۔ انکے ترجموں سے ملاقات ہے۔ بات کی بات میں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو سکتے ہیں۔ تمناشیں ایک طرف خود نالکہ پر داؤر ہوتا ہے۔ ہر وقت یہ خوف لگا رہتا ہے دنگی انکو یاد کرتی ہے۔ کہیں ایسا ہوا بنے ساتھ کل کے گھر جا بیٹھے۔

امیر جان کاظم علی پرہیز تھیں۔ برسوں اپنے پاس سے روپیہ دیا۔ ایک مرتبہ ہانس کے کوفے ادا کر کے دیدیئے اور صبح کو نفل بچایا کوئی ادا کر کے لے گیا۔ ایک دفعہ جھانے کی ایک فرد گیارہ سو کے جوڑ کی دیدی۔ اور کہہ دیا کہ عیش باغ کے سیلے میں کان سے گر گئی۔ اس طرح ہزاروں روپے کا سلوک کیا۔ گھر بھر کی روٹیاں اس پر جان کی بدولت تھیں۔

خورشید پارسے صاحب پر جان دیتی تھیں۔ بسم اللہ کے کوئی آشنا نہ تھا۔ طبیعت میں سفلہ بن تھا۔ کسی پر بند نہ تھیں۔

اوروں کا ذکر کیا۔ خانم صاحب پچاس پچپن برس کے بن میں میرا ولاد علی پر جان دیتی تھیں۔ میرا صاحب کا سن اٹھارہ اویس برس کا تھا۔ صورت دار جان تھے۔ کثرتی بدن تھا۔ اچھی اچھوٹ کی نگاہ پڑتی تھی۔ خانم کا رعب غالب تھا۔ کیا جمال کوئی بات کر سکے۔ یہ چارے غریب آدمی تھے۔ نان شبیہ کو محتاج۔ خانم کی بہنو سارا کنبہ پرورش پاتا تھا۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ لگا کے شادی کر دی۔ مگر رات کی رات کے سوایر صاحب کو کبھی شب کو گھر میں سونا نصیب نہیں ہوا۔ دن رات یہیں رہتے تھے۔ گھڑی دو گھڑی کو گھر بھی پوچھتے تھے۔

ایک اور مرزا صاحب کوئی ننہر برس کا سن۔ کمر جھکی ہوئی۔ ننہر میں دانست۔ نہ بیٹ میں آنت۔ خانم صاحب کے قدم آشناؤں میں تھے۔ اب ان سے کوئی واسطہ تھا۔ مگر گھر والوں کی طرح رہتے تھے۔ صبح شام کھانا خانم کے ساتھ کھاتے تھے۔ کپڑا خانم بنا دیتی تھیں۔ انیم۔ گنا۔ روٹیاں ان سب اخراجات کا بار خانم کے سر تھا۔ ایک دن ہم لوگ خانم صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ خورشید جان غم روہ صورت بنا بیٹھے ہیں۔

کیون! پیارے صاحب کی شادی ہوتی ہے۔ انہر غم سوار ہے۔ غم نے براہ نہمالیش کہا۔ "جادوچھو کر وہ نہیں معلوم اس زمانے کی تھیں کس قسم کی ہیں۔ جیسی زندیاں دیے ہی اونکے آشنا۔ ایک ہمارا زمانہ تھا۔ دیکھو (مرزا صاحب کی طرف اشارہ کر کے) ایک یہی مرد آدمی بیٹھے ہیں۔ جوانی میں مجھے آشنا ہی ہوئی۔ ان باپوں نے شادی ٹھہرائی۔ آپ انکے کا جوڑا ہیں کے مجھے دکھانے آئے۔ میں نے انکے کے جوڑے کے جوڑے پر زے کر دیئے۔ ہاتھ بڑے چھگی کر میں تونہ جانے دو گئی۔ اسکو پالیس برس کا زمانہ گذرا۔ آج تک گھر میں گئے۔ کہو ہے کوئی ایسا غنا راہی! سب نے سر جھکا لیا۔

یون نوربسم اللہ کی سہی بن میں پہلی پہلی ناچی گائی تھی۔ مگر پہلا مجرا مل نواب شجاعت علی خان کے لئے کی شادی میں ہوا تھا۔ وہ مخمل بھی باؤ کا تھی۔ نواب کی بارہوی کس شان سے بھی لٹی تھی۔ بیش قیمت خیرہ آلات کی روشنی سے رات کو دن ہو گیا تھا۔ سان ستھراؤں۔ ابرائی قالین۔ زربفت کے مستحکم۔ سامنے رنگ رنگ کی مردگون کی قطار روشن۔

خطر اور بھولوں کی خوشنہر سے تمام بارہوی بسی ہوئی تھی۔ دھوان و حار حقوں کی خوشبو۔ گلوریوں کی ہلکے دماغ مسخر تھے۔ میرا بن کوئی چوڑا برس کا ہو گا۔ اس زمانے میں بروہ سے ایک بانی جی آئی ہوئی تھیں۔ تمام شہر میں اونکے سکانے کی دھیم بھی۔ بڑے بڑے گوتے کان پر گرتے تھے۔ ملومات ایسی کہ دھیم گویا نوک زبان غنیمت۔ بگلا وہ کہ چار محلے اودھر آواز جائے۔ مگر واہ خانم صاحب دامن کی کیا رنگ مخمل دیکھتی تھیں۔ اون کے بعد جگہ کھڑا کر دیا۔ مجھے تو کیا لیز بھی مگر سمجھا دوں کہ حیران تھے کہ خانم کرنی کیا ہیں۔ بھلا بانی جی کے سامنے اس جہر کری کا کیا رنگ۔ جے گا پہلے گت خروار ہوئی۔ اس میں مخمل کچھ میری طرف مخاطب ہوئی۔ میری بھی ادھنی جوانی تھی۔ صورت اچھی نہ تھی۔ مگر اوقات کی بھرتی۔ چالاک۔ اٹھٹھ بن۔

کچھ نہ پوچھو شباب کا عالم! کیا کہوں کچھ عجب زمانہ تھا

گت غمزی ہی دیر ناچی ہو گئی کہ غام نے یہ غزل شروع کرادی۔

آج اس نرم بین وہ جملہ بنا ہونا ہے

دیکھئے دیکھئے اک آن میں کیا ہونا ہے

اس غزل کے شروع کرنے کے ساتھ ہی مغل نے دبا لا ہو گئی۔ اس کے بعد دوسرا مطلع

اک درابن نے بنا کے جو گایا۔ اہل مغل جھوٹے لگے۔

نالہ کرتا ہے تو سرگرم جفا ہونا ہے

درد غمنا ہے تو بیدار و خفا ہونا ہے

اور اس شعر نے تو قیامت ہی برپا کر دی۔

پھر نظر جھپتی ہے آنکھ جھکی جانی ہے

دیکھئے دیکھئے پھر تیرے خطا ہونا ہے

اس شعر پر یہ حال تھا کہ جس سے نظر ملا کے گایا۔ نظر نہ اٹھا سکا۔

بنت پرستی میں ہو گا کوئی جیسا بد نام ہے

جھپتا ہوں جو کہ میں ذکر خدا ہونا ہے۔

نرا اس شعر کو کہنے اور تپا س کہنے۔ عاشق مزاجوں پر اس کا کیا اثر ہوا ہو گا۔

عشق میں جس سے دل کا تو ٹکھنا کیسا ہے

دم ٹکھنے میں بھی کجخت فرا ہونا ہے

پھر اس کے بعد یہ شعر۔

حال دل ان سے نہ کہنا تھا میں جو کہ گئے

اب کوئی بات بنائیں بھی تو کیا ہونا ہے

تمام مغل وجد کے عالم میں تھی۔ ہر شخص محظوظ تھا۔ ہر لفظ پر داد دے! ہر سیم پر آ!

ایک ایک شعر آٹھ آٹھ دس دس مرتبہ گواہ کیا۔ پھر بھی سب سے نہیں ہوتی تھی۔

اسی غزل پر میرا مجرا موقوف ہوا۔ دوسرے مجرے میں پھر بھی غزل گرائی گئی۔

مرزا رسوا۔ وہ خبر مغل کا جو حال ہوا۔ اذرا سے خدا اور جس قدر شعر اس غزل کے

یاد ہوں سنا دیجئے۔ یہ کیسی غمزل ہے!۔

امراؤ۔ ادھی کیا آپ نہیں جانتے!۔

رسوا۔ میں سمجھا۔

امراؤ۔ اور شعر سنئے۔

تالیب کو دیکھو بچ جاتے ہیں مرنے والے

وہ بھی ادھونیت کہ جب شوق رسا ہوتا ہے

رسوا۔ سبحان اللہ۔

امراؤ۔ واقعی تسلیم تو رہا ہے۔

آہ میں کچھ بھی اثر ہو تو شعر بار بار کہوں

درد شعرا بھی حقیقت میں ہوا ہونا ہے

رسوا۔ یہ بھی خوب کہا ہے۔

امراؤ۔ اور یہ شعر۔

کس قدر متغیر حسن مکافات ہوئیں

دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج ہوا ہوتا ہے

رسوا۔ یہ فلسفہ ہے۔ اسے وہی خوب سمجھتے ہیں۔

امراؤ۔ اور کہنے۔

شوق اظہار اگر ہے تو مے دل کو نہ توڑ

اسی آجئے بن تو جلوہ بنا ہوتا ہے

رسوا۔ یہ قصود ہے۔ ہم دنیا کے لوگ ہیں۔ ہمیں اس سے کچھ غرض نہیں۔ مگر

”شوق اظہار“ یہ لفظیں کہہ کر لجا با کرتی ہیں۔

امراؤ۔ قطع کہنے۔

بمجر میں نالہ و فریاد سے باز آ۔۔۔۔۔

ایسی باتوں سے وہ بیدار و قفا ہوتا ہے

رسوا۔ مطلع سے قطع کمال با ہے۔ قطع کہنے کی فرصت نہ ملی ہوگی۔

امراؤ۔ فرصت ادھیں کب ملتی ہے!۔

پہلے مجھے کے دوسرے دن شام کو بوا حسینی میرے کمرے میں آئیں۔ ایک خدمتگار۔
اونکے ساتھ تھا۔

بوا حسینی۔ دیکھو۔ امرا و صاحب یہ کیا کہتا ہے۔

اُنکا کہے بوا حسینی کمرے کے باہر چلی گئیں۔

خدمتگار (سلام کر کے) مجھے ذاب سلطان صاحب نے بھیجا ہے جو کل شب کو
محل میں زرد مندیل کسر پر رکھے دو لٹا کے دہنی طرف بیٹھے تھے۔ اور فرمایا ہے کہ
نک کسی وقت آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔ بشرطیکہ میں وقت میں آؤں اور نہ
اود کوئی نہ ہو۔ اور اوس عہد کی نقل مانگی ہے جو آپ نے کل نکائی تھی۔

میں ذاب صاحب سے میری تسلیات کہنا۔ اور کہنا کہ شام کو جب باغیچہ تشریف
لائے۔ تخلیہ ہو جائے گا۔ غزل کے لیے کل دن کو کسی وقت آنا۔ لکھنؤ کی۔

دوسرے دن ہر دن چھ خدمتگار آئے۔ میں کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی عہد کی
نقل میں نے کرکھی تھی اوسکے حوالے کی۔ اوسنے پانچ اشرفیان کمرے نکال کے

مجھے دیں۔ اور کہا کہ ذاب صاحب نے کہا ہے کہ آپ کے لائن نوہین۔ مگر خیر نہ پان
کھانے کے لیے میری طرف سے قبول کیجئے۔ آج شب کو چران جیلے کے بعد میں ضرور

آؤں گا۔ خدمتگار سلام کر کے رخصت ہوا۔ اوسکے جانے کے بعد پہلے نو مجھے خیال ہوا
کہ بوا حسینی کو بلا کے۔ اشرفیان دیدون۔ وہ خانم کے حوالے کریں۔ پھر ایک دفعہ

اشرفیوں کی طرف سے دیکھا۔ چکنی چکنی نئے گھن کی اشرفیان۔ بھلا میرے دل سے کب
نکلتی تھیں۔ اوسوقت صندوچہ وند وچہ نو میرے پاس تھا۔ پٹنگ کے پاس کے بیچے

دباؤں۔

زرار و صاحب۔ میرے نزدیک ہر عورت کی زندگی میں ایک وہ زمانہ آتا ہے جب
چاہتی ہے کہ اوسے کوئی چاہے۔ یہ کچھ کچھ لگا کہ یہ خواہش چند روزہ ہوتی ہے۔ بلکہ غم
شباب سے اسکی ابتدا ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسکا نشو و نما ہوتا رہتا ہے۔ جس سے
اس بڑھتا ہے اوس قدر یہ خواہش بڑھتی رہتی ہے۔

گو ہر مرد جنک بھرا چاہے والا موجود تھا۔ مگر اوسکی چاہت اور تم کی تھی۔ اوسکی
چاہت میں ایک بات کی کمی تھی۔ جسے میرا دل ڈھونڈتا تھا۔ مردانہ محبت کو اوسکی
طہنت میں لگاؤ نہ تھا۔ مان کا ڈومنی پنا اوسکے خیر میں داخل تھا۔ وہ جو کچھ پنا

مجھے تھیں تبھیٹ کے لے لیتا تھا۔ خود ایک روپے کے سوا جسکا ذکر رکھی ہوں۔
کبھی نہیں دیا۔ اب میرا دل ایسا عاشق ڈھونڈتا تھا۔ جو میری ناز برداری کرے۔

روپہ خرچے کھلائے۔ پلائے۔ ذاب سلطان صاحب (نوا صاحب کا یہی نام
آدی نے بتایا تھا) صورت شکل کے اچھے تھے۔ اُن کے چہرے پر اس قسم کا

مردانہ وجہ تھا۔ نہر عورت ہزار دل سے فریفتہ ہو جاتی ہے۔ بعض لوگ غلطی سے
یہ خیال کرتے ہیں کہ عورت کو صرف خوشامد اور اظہار عشق پسند ہے۔ بیشک پسند ہے

مگر شرط یہ ہے کہ اوس میں ذرا بھی کینہ نہ ہو۔ جو لوگ اندیون کا گھناٹا کتے ہوتے آئے
ہیں۔ جتنے پرکھائے سے یہ مٹا کھانا ہے کہ میں چاہو۔ خدا کے لیے چاہو۔ چاہو اور ہمارا

گھر بچاؤ جو کچھ تمہارے پاس ہے ہمیں دیدو۔ اور ہمارے گھر کی مالگیری کر دو۔ روڈیان
پہاچکا کے کھلاؤ اور ہماری اور ہمارے بال بچوں کی جوتیان سیدھی کر دو۔ ہر شخص کا

حسن حضرت یوسف کا معجزہ نہیں ہے کہ ہر ایک عورت اور ہر جان دینے لگے۔
مرد عورت سے اور عورت مرد سے محبت کرتے ہیں۔ مگر اس محبت میں اکثر غرض

ذاتی کا بھی لگا ہوتا ہے بے غرض محبت جیسے یلی محبت۔ شیرین فرماؤ۔ یہ صرف
قیے کہانیوں میں سنی جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک طرف محبت نہیں ہوتی۔ یہ

اسے بھی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مگر اوسکو نخل دلع سمجھنا چاہیے۔ پھر کیا ضرور ہے کہ
مرد و عورت دونوں دیوانے ہوں۔

دوسرے دن شب کو ذاب صاحب تشریف لائے۔ بوا حسینی سے معمولی گفتگو کے بعد
تین اخراجات کو کمرے میں تخلیہ ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ ذاب صاحب نے ملازمین رکھا

صرف۔ طے ہوا ہے کہ کبھی بات کو گھڑی و گھڑی کے لیے آیا کرینگے۔ ذاب صاحب
بہت ہی کم سخن۔ جتوے آدی تھے۔ سن اٹھا رہا اونیس برس کا تھا۔ اسم اللہ کے کنبہ

میں پرورش پائی تھی۔ سان باب کے دباؤ میں تھے۔ دنیا کے محل ذریعہ سے
بالکل آگاہ نہ تھے۔ اظہار عشق خدمتگار کی زبانی ہو چکا تھا۔ ورنہ ذاب صاحب کو آئیں

ہی کسی قدر شکل ہوئی۔ مگر میں نے غصہ دیا کہ میں نے کھانہ بنایا۔

بہت سی لکھ وٹ کی باتیں کہیں۔ بالکل عاشق زار نگینی۔ زمین کچھ کچھ ٹھٹھٹھ
سج نواریلے تھا کہ نوا بھاب کی صورت ایسی نہ تھی کہ ایک عورت خواہ وہ کسی
ہی سخت دل کی ہو اور نہ پائل نہ ہو جائے۔ گری گری رنگت۔ جیسے گلاب کا پھل
سو تو ان ناک۔ نیلے نیلے ہونٹ۔ خوبصورت بینی۔ گھونگھروالے بال۔ کتابی چہرہ۔
ادب کا ماحا۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ بھرے بھرے بازو۔ مچھلیاں پڑی ہوئیں۔ چوڑی
کلا بٹان۔ بلند بالا۔ کثرتی بدن۔ خدا نے سر سے لے کے پاؤں تک تمام بدن کے
سائے بن ڈھالا تھا۔ اوپر بھولی بھولی باتیں۔ بات بات میں عاشقانہ شعر
جنہیں سے اکثر اوصاف کی تصنیف تھی۔ شعر پڑھتے ہیں ہوا کو ٹوٹا ہوا تھا۔ خاندانی
شاعر تھے۔ شاعر و نون میں اپنے والد کے ساتھ غزل پڑھتے تھے۔ شاعر و نون کو کیا
عاشقانہ شعر ہو کسی کے سامنے پڑھتے ہوئے جھپ نہیں ہوتی۔ خرد بزرگ کے ساتھ
اور بزرگ خرد کے سامنے چاہے اور قسم کی گفتگو نہ کر سکتے ہوں۔ مگر شعر پڑھنے میں
تکلف نہیں ہوتا۔ شعر بھی ایسے کہ اگر نثر میں ادب کا مطلب ادا کیا جائے تو مدد سے
کہتے نہ جاتے۔ غرض کہ اس شب کو بڑے مزے کی صحبت تھی۔

نواب۔ آپ کی اداؤں نے تو مجھے ایسا فریفتہ کر دیا کہ بغیر آپ کے دیکھے مجھے میں ہی
انہیں آسکتا۔

میں۔ یہ سب آپ کی قدر دانی ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری حقیقت کیا۔ ایازند
خود بہ شناس۔ میں آؤں کہ من در غم نہ

نواب۔ اوہ ہوا آپ تو خواندہ معلوم ہوئی ہیں۔

میں۔ جی ہاں۔ کچھ شہد بد پڑھا تو ہے۔

نواب۔ اور گفتا بھی جانتی ہو۔؟

میں۔ جی ہاں لکھ بھی جیتی ہوں۔

نواب۔ تو وہ غنہ ل آپ ہی کے ماتھے کی لکھی ہوئی ہے۔؟

میں۔ شکر کے چپ ہو رہی۔

نواب۔ واٹھ کیا یہ رافط ہے۔ اس بات سے تو بہت ہی بی خوش ہوا۔

خدا شکاروں سے دل کا حال کہتے نہیں بننا۔ اب زبانِ قلم سے گفتگو ہوا کرے گی۔
ہم تو ایسا چاہتے ہی تھے۔ جہاں تک ہو کسی ایسے معاملے میں غیر کی وساطت نہ ہو۔
غیروں کی وساطت ہو نہ یا دون کی شہادت ہو
جو میں آپس کی باتیں دلاؤں اور ان کے ہمیں غم ہوں

میں۔ یہ آپ ہی کا شعر ہے۔؟

نواب۔ جی نہیں والد مرحوم نے فرمایا تھا۔

میں۔ کیا خوب فرمایا ہے۔

نواب۔ انا و اشد۔ آپ کو شعر شاعری کا بھی مذاق ہے۔

اچھی صورت جو خدا سے تو یہ اوصاف بھی لے

حسن نقشبند بھی ہو خوبے تحسیر بھی ہوٹ

میں۔ کیا شعر ہے۔

نواب۔ ادھمکین کا۔

میں۔ کیا خوب فرمایا ہے۔

نواب۔ جی ہاں وہ ایسا ہی فرمانے تھے۔ مگر واٹھ۔ آپ کی شان کے لائق

میں۔ یہ فقط آپ کی عنایت ہے

ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا

نواب۔ واہ! کیا صاف صاف شعر ہے!

میں۔ تسلیم۔ نواب۔ یہ کہنے آپ شعر بھی کہتی ہیں۔

میں۔ جی نہیں۔ آپ ایسے قدر دانوں سے کہو الیٹی ہوں۔

اس بات پر نوا بھاب پہلے تو اک ذرا چین چین ہوئے۔ پھر نئے شکرانے ہو کر

دیکھ کے ہنس پڑے۔

نواب۔ خوب کہی۔ جی ہاں اکثر دنوں کا یہ دیکھ رہا ہوں کہ یادوں سے شعر

کہو اسکے اپنے نام سے پڑھا کرتی ہیں۔

میں۔ آپ دنوں کو کہیے کیا مراد ایسا نہیں کرتے۔

نواب۔ واٹھ سچ ہے۔ والد کے دوستوں میں اکثر ایسے صاحب ہیں جنہوں نے

کبھی ایک عصر عینین کہا اور ہر شا عسے بن غزل پڑھنے کو مستعد اکثر قوالد ہی
کہدیا کرتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ سری غزل میں شعر نادر بے چھاٹ دیئے ہیں
کہتا ہوں اسین لطف ہی کیا ہے۔ والدہ زوجہ فرمایا کرتے تھے کہ بے حضرت ادب و ادب کے
بنائے ہوئے شعر دیوان سے کمال ڈالے۔ جھولی فریغون سے دل کو کیا خوشی ہوتی ہوگی
میں۔ خدا جانے! یہ بھی ایک ہوس ہے۔ اور بڑی ہوس۔

نواب۔ آجھا تو اس عشق کا اور کوئی شعر یاد ہو تو پڑھیے۔

میں۔ فرض سے ضبط نالہ و منہ یاد دے

جس سے ناخوش ہوئے وہ عادت کیا!

نواب۔ کیا شعر کہا ہے۔ پھر پڑھیے۔ دانش کی نئی بات کہی ہے۔

میں۔ (شعر دوبارہ پڑھ کر)۔ تسلیم۔ آپ تدریسی کرتے ہیں۔

نواب۔ شعری اچھا ہے۔ اور کوئی شعر پڑھیے۔

میں۔ اس طرح میں سری غزل نہیں۔ یہ دو شعر بھی کہے ہیں۔

نواب۔ برا اور طرہ ہوا۔ فی السبب یہ اور ایسے شعر۔ آجھا اور کسی غزل کے شعر پڑھیے۔

میں۔ اب آپ ارشاد کیجئے۔ اسلئے بن نے بخت کی تھی۔

نواب۔ میں تم سے دینا ہوں مگر آپ کو غزل پڑھنا ہوگی۔

اننے بن کرے کا دروازہ دھڑک سے کھلا۔ اور ایک صاحب پچاس پچاس کا برک
بن۔ سیاہ رنگت۔ کڑی داڑھی۔ ترجمی گہری باندھے۔ مکر بندھی ہوئی۔ کنارنگی ہوئی
کرے کے اندر گھس گئے۔ اور آتے ہی نہایت ہی بے تکلفی سے برابر ان کے باکے بیٹھ
گئے۔ نواب صاحب نے سری طرٹ دیکھا۔ میں نے سر نہ جھکا لیا۔ کا ٹوٹو بہن میں نہیں
کہاں تو نواب سے یہ اقرار تھا کہ بالکل غلبہ ہوگا۔ کرے میں کوئی نہ ہوگا۔ کس مزے کی
گنگو۔ کیسا شہزادان تھا۔ کیا راز دینا پورا تھا۔ کہاں یہ بلا سے ہیب نازل ہوئی۔ سنگ
آمد و سخت آمد۔

ان صاحب نے بیٹھے ہی نواب کی طرف گھور گھور کر دیکھنا شروع کیا۔ جیسے کوئی
اپنے باپ کے غافل کو دیکھتا ہو۔ کھڑی کھڑی کنارہ باندھ جانا تھا۔ میں تو دل بن بھی
جاتی تھی۔ بااثری یہ کیا آفت ناگمانی ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ نواب اپنی طرف

کھنچے ہوئے بیٹھے ہیں۔ نوربان چڑھی ہوئی ہیں۔

ہائے کیا منے کی صحبت تھی۔ اس کجبت نے کیا فرے میں غلٹ ڈالا۔ ذاب
ابھی غزل پڑھنے کو تھے اور اسکے بعد میں کچھ کہتی۔ ذاب قریض کرتے کیا دل خوش
ہوتا۔ آج ہی تو ایک ایسا تدریسی لانا تھا۔ جسے مدتوں سے میرا دل ڈھونڈتا
تھا۔ اور آج ہی اس آفت کا سامنا ہوا۔ خدا اس ٹوے کو جلدی بہان سے اڑاؤ۔

یہ خیالات میرے دل میں تھے اور وہ خوشوار صورت آنکھوں کے سامنے تھی جسکی

طرف دیکھنے سے میرا دل لڑا جاتا تھا۔ یہ تو میری جان کو گویا دلاور خان ہو گیا۔

بار بار یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ یہ کنارہ کی کمرین سے یا میرے کیلجے کے پار ہو گئی یا غلٹ

نواب کو کچھ گزند پہنچائے گی۔ دل ہی دل میں کوئی تھی۔ خدا غارت کرے

تو کہاں سے ہوتی آگیا۔

آخر مجھے اور تو کچھ نہ بن پڑا بوا حسینی کو آواز دی۔ اونھوں نے آکے جوہر باجراد

سمجھ گیس۔ بوا حسینی کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ ان صاحب کو کچھ چاہتی تھی۔

بوا حسینی۔ خانصاحب مجھے کچھ سے عرض کرنا ہے اور صبر شریف لائیے۔

خانصاحب۔ جو کچھ کہنا ہے وہ میں سے کہو۔ ہم لوگ کہیں مجھ کے اوٹھے نہیں۔

بوا حسینی۔ تو خانصاحب کوئی زبردستی ہے۔

خانصاحب۔ اس میں زبردستی کیا۔ رنڈی کے کمان پر کسی... کا اجارہ

نہیں۔ اور اگر زبردستی ہے تو زبردستی ہی ہے۔ ہم تو نہیں اوٹھے کے۔ دیکھیں

تو میں کون... اوٹھا دیتا ہے۔

بوا حسینی۔ اجارہ کون نہیں۔ جولد خرچے کا رنڈی اوس کی ہے۔ پھر اور کوئی آفت

ہیں آسکتا۔

خانصاحب۔ تو کیا نہ خرچ کرنے کو ہم تاب رہیں۔

بوا حسینی۔ آجھا اس وقت اسکا کوئی موقع نہیں۔ اور کسی وقت شریف لائیے گا۔

خانصاحب۔ عورت کچھ دہی ہوئی ہے۔ کہدیا ہم نہیں اوٹھیں گے۔

میں نے دیکھا کہ نواب کا چہرہ مارے فحشے کے شرع ہو گیا۔ مگر ابھی تک پیپے

ہیں۔ کچھ حد سے نہیں بولنے۔

لو احمی - یعنی اچھا تو اور واروٹھ کے چلی آ۔ (اوصاحب آپ کے آرام کا وقت ہے۔ کہنے پر تشریف لے جایئے۔)

مین نے اونٹنے کا ارادہ کیا۔ اوس نگوڑے مارے نے زور سے میراٹھ پکڑ لیا۔ اب کیا کروں !

نواب - خالصاحب زٹی کاٹھ چھوڑ دیجئے اسی میں خیریت ہے۔ آپ بہت کچھ زیادتی کر چکے ہیں۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ صرف اس خیال سے کہ زٹی کے مکان پر نہ تک کرنا اچھا نہیں۔ مگر اب۔۔۔۔۔

خالصاحب - مگر اب تم کیا کر سکتے ہو۔ دیکھیں تو کون۔۔۔۔۔ زٹی کاٹھ پھردا لیتا ہے۔

مین (دند سے ماتھ جھٹک کے) اچھا تو ماتھ چھوڑ دیجئے۔ میں کہیں جاتی نہیں۔ (واحمی مین نواب کو چھوڑ کے ہرگز نہ جاتی)۔

خالصاحب نے ماتھ چھوڑ دیا۔

نواب - میں کہے جاتا ہوں کہ زمانہ ان سہال کے گھنگو کھجے معلوم ہوتا ہے آپ نے شرفیوں کی صحبت نہیں اٹھائی۔

خالصاحب - خیر تم نے تو شرفیوں کی صحبت اٹھائی ہے جو کچھ تمہارے کرلو۔

نواب - یہ تو معلوم ہوا کہ آپ لڑنے پر آمادہ ہیں۔ مگر زٹی کا مکان کوئی اکھاڑا نہیں ہے نہ میدان۔ بہتر ہے کہ اسکو اور کسی وقت پر موقوف رکھیے اور آپ تشریف لے جایئے۔ نہیں تو۔۔۔۔۔

خالصاحب - نہیں تو تم مجھے گھول کے پی جائیے۔ تشریف لے جایئے کی تو کہی۔ ٹھیک کیوں نہیں چلے جاتے۔

نواب - خالصاحب - جناب ایڑ کی قسم میں بہت طرح دیتا ہوں۔ اسلئے کہ مجھے کسی قدر اپنی عزت کا خیال ہے۔ والدین - غرض۔ دوست اجاب جوئے کا نام رکھے گا۔ ورنہ آپ کو ابھی ان لستیاخون کا نرا چکا دیتا۔ پھر میں آپ سے کہتا ہوں کہ بے فائدہ جھگڑنا چھوڑ دیجئے۔ تشریف لے جایئے۔

خالصاحب - زٹی کے گھر پر آئے ہو۔ اور اماں جان سے ڈرتے ہو۔

گستاخان کہیسی - میں کوئی تمہارے باپ کا ذکر نہیں کرتا۔ تم اپنے گھر کے بیٹے اور ہر تو ہوا کرو۔ زٹی کے مکان پر تم بھی بیٹھے ہو۔ ہم بھی بیٹھے ہیں۔ جب ہمارا جی چاہے گا جائیں گے۔ تم خود بیکار و بخت کرنے ہو کسی کو اٹھا دیتے دیکھا نہیں۔ نواب - اٹھا دینا تو کوئی مشکل نہیں۔ خود گکاروں کو آواز دینا ہوں تو آپ کی گردن میں ماتھ دے کے ابھی نکال دیتے ہیں۔

خالصاحب - خود گکاروں کے بل پر نہ جھوٹا یہ کتا بھی دیکھا ہے !

نواب - ایسے بہت سے کتا رکھے ہیں جو دفعت پر کام آئے وہ کتا ہے آپ کی کتاریاں سنے کھلتی رہیگی۔ یہاں تو ابھی آپ کی گردن ناپ دیکھا گیا۔ پھر دیکھا جائے گا۔

خالصاحب - اے اب تمہیں گھر کو جاؤ انان جان یاد کرتی ہو گی۔

مین دیکھ رہی تھی کہ نواب کا چہرہ بالکل تغیر ہو گیا ہے۔ مارے فتنے کے فخر فخر کانپ رہے ہیں۔ گردا گردی شرافت اوس باجی نے کس قدر سخت قسمت کہا مگر یہ آپ ہی آپ کر کے بات کر رہے ہیں۔ اس سے مجھے پہلے ذیہ خیال ہوا کہ نواب ڈر گئے۔ مگر یہ خیال میسر نہ نکلا۔ واقعی نواب کو اپنی عزت کا خیال تھا۔ اسی لئے طرح دے رہے تھے۔ چاہتے تھے کہ ماتھ بھرت سے رنج دہجہ دجائے مگر اوس باجی کی بدزبانی بڑھتی جاتی تھی جس قدر نواب طرح دیتے تھے وہ اور شیر ہو جاتا تھا۔ آخر نواب نے کہا۔

نواب - اچھا اٹھئے خالصاحب ہم آپ دونوں یہاں سے چلے عین عیش باغ میں چل کے ہمارے آپ کے دودو ماتھ ہو جائیں۔

خالصاحب - (فتنہ مار کے) ماضی دے ابھی تم خود منہ جھسنے کے لائق ہو۔ اور مردوں سے غلام بنی کر کے کا حوصلہ کہیں کوئی چپکا کھا جاؤ گے تو انان جان روتی بکس رہیگی۔

نواب - مردود اب میری بدزبانیان حد کو پہنچ گئی ہیں۔ دیکھ اب نتیجہ تیری گستاخی کی سننا دیتا ہوں۔

یہ کہتے ہی کہتے نواب نے دودو کی کے اندر سے اٹھ کالہ ہاتھ میں پتھر سمٹھا

دن سے داغ دیا۔ خانصاحب دھم سے گر پڑے۔ مین سن سے ہو گئی۔ زین پر خون
ہی خون نظر آتا تھا۔ بوجھنی جہان کھڑی یقین۔ کھڑی رہ گئیں۔ پنپنے کی آواز سننے
خانصاحب۔ مرزا صاحب۔ میر صاحب۔ خورشید جان۔ امیر جان۔
بسم اللہ جان۔ خدمتکار۔ مہریان۔ زمین سب دوڑے آئے۔ میرے کمرے میں
بھڑک ہو گئی۔ سب اپنی اپنی کہنے لگے۔ اسنے مین۔
شمشیر خان (ایک ادھیڑ سا آدمی ذوالصاحب کا ملازم) نے ایک کے ذواب کے
اتھ سے پنچے لے لیا۔ اور کہا۔ لے اب حضور گھر تشریف لے جائیں۔ مین سمجھ لو لگا۔
ذواب۔ مین نہیں جانا۔ اب جو کچھ ہوا ہوا۔ اور جو کچھ ہونا ہو گا ہو جائے گا۔
شمشیر خان۔ (کمرے چھری کمال کے) جناب امیر علیہ السلام کی قسم۔ ابھی اپنے
کلیجے میں مار لوں گا مین تو براے خدا آپ چلے جائیے۔ آپ کا یہاں ٹھہرنا اچھا
نہیں ہے۔

اسنے مین لوگوں نے دیکھا۔ خانصاحب کے گولی کہاں لگی۔ معلوم ہوا کہ جان کی
خبریت ہے۔ باز مین گولی لگی تھی اور سپار ہو گئی۔
شمشیر خان۔ مین عرض کرتا ہوں کہ حضور تشریف لے جائیں۔ اس مرد و دکا ہوا
کیا ہے۔ آپ کون بدلتا ہوتے ہیں۔

بارے ذوالصاحب بھی کچھ سمجھ کے اوٹے۔ ایک آدمی ہمارے یہاں سے ساتھ
سکا گیا۔ گھر تشریف لے گئے۔ خانم نے اوسی وقت مرزا علی رضا بیگ کو بلو بھیجا کہ وہ
جو کہ ہی مین تھے۔ نور آچلے آئے۔ خانم نے علیحدہ لیجا کر مین معلوم کیا کہ ان میں ہر کا۔
دوان سے آئے تو یہ کہتے ہوئے آئے

مرزا۔ ہوگا۔ چیک و مرد و مرد کو کمرے کے نیچے۔ سمجھ لیا جائے گا۔
خیر۔ خانصاحب کو کمرے کے نیچے تو نہیں پھینکا۔ باز پر مٹی باندھی۔ ڈولی بلوائی لگی
خانصاحب کو بھی کسی درد ہوا سن آگیا تھا۔ لیکن کا پتہ نہ پچھا۔ معلوم ہوا۔ مرغ خانے بنا
رہتے ہیں۔ ڈولی پر بٹھائے ان کے گھر بھجوا دیا کہ اردن کو سمجھا دیا تھا۔ لیکن ان کے
قریب کہیں ہوا دنا کے چلے آنا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

سلطان صاحب کئی دن تک نہیں آئے نہ ادکا آدمی آیا۔ مجھے اون سے محبت سی ہو گئی
تھی یقین تھا کہ وہ اب نہ آئیں گے۔ اور آدمی ایسا تھا بھی۔ دھنور آدمی تھے
پہلے ہی جب وہ آئے تھے آدمی کی زبانی پیتر بہت تاکید تھیلے کے لیے کر دی تھی۔
بوجھنی نے اترا کر لیا تھا کہ کوئی نہ آئے پائے گا۔ مگر اتنی جھوک ہو گئی کہ دروازے
پر کسی کو ٹھانڈا دیا۔ خانصاحب انہیں ڈھیلا۔ خدا جانے کہاں سے آن پڑے۔ سارا
کھیل بگڑ گیا۔ اتفاق سے پانچ چار دن کے بعد میرا ایک۔ رات میں بچھا آگیا تھا۔
دوان ذواب سلطان صاحب بھی تشریف رکھتے تھے میرا پہلا بچہ انہیں رات کو
شروع ہوا تھا۔ محل میں بات کرتا کہ اس اشارے کا بھی موع نہ تھا۔ ایک لڑکا
گو ناگرا کوئی نوے برس کا سن۔ بیماری کپڑے پہنے سلطان صاحب کے پاس بیٹھا
تھا۔ کسی ضرورت سے اٹھا۔ میرا بچہ ابر بچا تھا۔ علیحدہ کمرے میں بیٹھا اوتا رہی تھی
مین نے اسے اشارے سے بلو لیا۔ پاس بیٹھایا۔ ایک پان لگا کے دیا۔ پوچھا۔
مین۔ سلطان صاحب کو جانتے ہو۔

لڑکا۔ کون سلطان صاحب؟

مین۔ وہ جو دھکا کے برابر تھا اسے پاس بیٹھے تھے۔

لڑکا۔ (توری جڑھا کے) واہ واہ تو ہمارے بڑے بھائی ہیں۔ ادھین ذرا
سلطان صاحب نہ کہنا۔

مین۔ آج تو ہم تھیں کچھ دین ادھین دیدرگے؟

لڑکا۔ کہیں وہ ہمیں خانا ہوں

مین۔ خانا نہیں ہونگے۔

لڑکا۔ اور دوگی کیا۔ پان؟

مین۔ پان مین پان تو انکے خاں صدان میں ہونگے۔ اسے لویہ کا غذا دیدرنا۔

ایک پرچہ کاغذ کا کمرے میں فرش پر پڑا تھا۔ مین نے اوپر کوٹھے سے پتھر کھدوا۔

مردن سے ہم مین محسوس عتاب

بزم میں آج اوکو چھوٹا چاہیے +

اور کھانا دیکھ کر کاغذ اٹھائی آنکھ بچا کے سامنے رکھ دیا اور نگو معلوم بھی نہ ہو گا۔ (رکے نے ایسا ہی کیا۔ مین کمرے کے پرٹ کی آڑ سے جھانک رہی تھی۔ سلطان صاحب نے وہ کاغذ اٹھایا پڑھا۔ پہلے تو چہرے پر کچھ نگر کے آثار ظاہر ہوئے۔ پھر غور سے دیکھ کر غور سے پرے کو دیکھنے لگا۔ اور کچھ بعد شکر کے جیب میں لکھ لیا شمشیر خان کو اشارے سے بلایا۔ اور سکے کان میں کچھ چپکے سے کہا۔ کوئی گھنٹے بھر کے بعد شمشیر خان ہمارے کمرے میں آیا۔

شمشیر خان۔ ذرا بھابھ نے کہا ہے اوس پرے کا جواب ہم گھر پر جا کے لکھ دینگے۔ دوسرا جواب صحیح کہہ دیا تھا اور وقت سلطان صاحب نعل میں نہ تھے۔ اور کچھ غیر محفل مجھے شونی معلوم ہوتی تھی۔ مگر مین دل نہ لگتا تھا۔ آخر جون توں مجھ سے ختم ہوا۔ مین گھر پہنچی۔ اور دن دن شمشیر خان کا انتظار دیا۔ بارے چراغ جلنے کے بعد وہ آیا۔ ذرا بھابھ کا رتہ دیا۔ مضمون یہ تھا۔

”تمہارے شعر نے اوس آگ کو جو میرے دل میں دبی ہوئی تھی کربد کر بچ کر دیا۔
 وائمی مجھے تم سے محبت ہے۔ مگر پاس وضع سے مجبور ہوں۔ تمہارے مکان پر اب ہرگز نہ آؤں گا۔ میرے ایک بے تکلف دوست فرائیج میں رہتے ہیں۔ کل میں تین دن مان بلوا لیوں گا بشرط فرصت چلی آنا۔ یہی ایک صورت ملنے کی ہے وہ بھی دوسرے مہینے تک۔“

شب وصال کی کوتاہیوں کا شکوہ کیا
 یہاں تو ایک نظر دیکھنے کے لئے ہیں

سلطان صاحب اوس دن سے کبھی خانہ کے مکان پر نہیں آئے۔ چھ مہینوں میں مرتبہ فرائیج میں ذرا بے صاحب کے مکان پر بلوا بیٹھے تھے۔ جب لطف کی محبت رہتی تھی۔ کبھی خیر و سخن کا چراغ ہوا۔ کبھی ذرا بے صاحب بلبلہ بجاتے لگے مین گانے لگی۔ سلطان صاحب خود بھی گانے تھے۔ تال تم سے تو کچھ ایسے دا نہ تھے مگر اپنی غزل آپ خوب گائیے تھے۔ یہ شعر

کچھ ہر طرح سے نظر باز لڑن کی شوق تھی + مین اؤ نکھا وہ میری نظر کو دیکھتے ہیں

جب یاد آتا ہے اوس طے کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ گرمیوں کے دن شب مہتاب کا عالم۔ محسن باغ میں گھون کے چوکے پر سفید باندنی کا کچھ ہے گاؤں کے گئے ہوئے۔ سامان میں شمشیر نفاطہ بیٹا باغ میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے۔ جیلے جلی کی جھک سے دماغ معطر خوشبو دار گلوریاں۔ بے ہوشے تھے۔ تھلے کا جلسہ آپس کی چٹیلین۔ بے تکلفی کی باتیں۔ ایسے ہی مجلسوں میں میچکر دنیا و اینہا کا تو ذکر کیا۔ انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے۔ اور ایسی کی مہرا ہے کہ ایسے طے بہت ہی جلد برہم ہو جاتے ہیں۔ اور اؤ نکھا افسوس کرتے دم تک رہتا ہے بلکہ شاید مرنے کے بعد بھی۔

لذت مصیبت عشق نہ پوچھے

خلدین بھی یہ بلا یاد آئی

وائمی سلطان صاحب کو مجھے اور مجھے اؤن سے محبت تھی۔ ورنہ کے مذاق کچھ ایسے طے ہوئے تھے کہ اگر عہد بھر کا ساتھ ہوتا تو کبھی ملال نہ ہوتا۔ سلطان صاحب کو شرو سخن کا شوق تھا۔ اور مجھے بھی بچپن سے اس کی لذت ہے۔ سلطان صاحب سے جیسا میرا دل ملا اور کسی سے نہیں ملا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اسی سبب سے مجھے محبت کرنے لگے۔ بات بات میں وہ شعر پڑھتے تھے۔ مین جواب دیتی تھی۔ مگر اؤن کو س فلک تفرقہ اندازے نہ وہ جلسہ بہت ہی جلد برہم کر دیا۔

دل یہ کہتا ہے نہ زبان ماہ و انجم و کھمکر

ہائے کیا کیا محبتیں راتوں کی برہم ہو گئیں

رسوا۔ اچھا وہ تو سب کچھ ہوا۔ آپ کے قدم کی برکت سے ایسے ایسے بہت سے طے برہم ہو گئے ہونگے۔

اعراؤ واہ درزا صاحب تو کیا مرے دشمن نہیں ہیں۔ یہ آپ نے خوب کہی۔

رسوا۔ یہ تو مین نہیں کہہ سکتا۔ مگر سلاطین سے جہاں آپ تشریف لیگیں صفائی ہوئی

امراؤ۔ اب جو چاہے کہیے۔ اگر ایسا جانتی کہ آپ یہ کہیں گے تو اپنی روداد ہر گز نہ دینا

کرتی۔ خراب تو حضور ہوا۔

رسوا۔ تصویر ہی تو آپ نے زندگی بھر میں ایک کلام کیا۔ جس سے آپ کا نام دنیا میں رہا ہے گا۔

خواہ نیکنامی کے ساتھ خواہ بدنامی کے ساتھ اسکا میں ذمہ نہیں کرتا۔ اب اس بات کو بہین تک رہنے دیجیے۔ ذرا اس غزل کے دو میں شعر اور یاد ہوں تو پڑھ دیجیے۔
امراؤ! آپ بھی آدمی کو خوب بناتے ہیں۔

رسوا۔ خیر بگاڑنا تو نہیں۔ اچھا اب شعر پڑھیے۔

امراؤ! آجٹا۔ نیسے۔ ایک مطلع اور دو شعر اور یاد ہیں۔ مطلع۔

درد دل کی لذتیں صرب شب غم ہو گئیں

طویل فرقت سے بہت بیتا بیان کم ہو گئیں

وہ جو نیٹے سوگ میں زلف رسا کھولے بہت

حسرتیں میری شد یک بزم نام ہو گئیں

ہم نشین دیگھی غمت داستانِ جبر کی

صحتیں جس نے نہ پائی تھیں کہ برہم ہو گئیں

اسی زمانے میں نواب جعفر خان صاحب کی ملازم ہوئی۔ میں شریف کوئی نثر برس کے قریب تھا۔ مژدہ میں ایک دانت نہ تھا۔ پشت خم ہو گئی تھی۔ سر میں ایک بال سیاہ نہ تھا۔ مگر اب تک اپنے کو پیار کرنے کے لائق سمجھتی تھی۔ اے وہ اککا بھلی کا اگر کھا اور گلبدن کا پا جانہ۔ لال نغیر۔ مصالح دار ہوئی۔ کاکلین بٹے ہوئی۔ عمر بھر نہ جو لین گی۔

آپ جیسے گا کہ اس عراوہیسی حالت میں زبیدی نوکر کھنا کیا ضرور تھا۔ سینے مڑا تھا۔ اس زمانے کا فن ہی تھا۔ کوئی امیر رئیس ایسا بھی ہو گا جسکے پاس زبیدی نہ ہو۔ ذابصاحب کی کسر کلازین جہان اور سامان شان و شوکت کے تھے۔ دامن سلامتی بنانے کے لیے بلوکیوں میں ایک زبیدی کا بھی اسم تھا۔ پچھتر دو پہر ماہوار ملتے تھے۔ دو گھنٹے کے لیے معاجرت کر کے علی آتی تھی۔ اور مکلف سینے ذاب بوڑھے ہو گئے تھے۔ مگر کیا مجال تو بچے کے بعد دوا نہ خانے میں بھیج سکیں۔ اگر کسی دن افغان سے دیر

ہو گئی۔ کھلائی آ کے زبردستی ادا ٹال لیا تھی۔ ذابصاحب کی والدہ زندہ تھیں اسے اسی طرح ڈرتے تھے۔ جس طرح پانچ برس کا بچہ ڈرنا ہو۔ بوی سے بھی انتہا کی محبت تھی۔ بچہ میں شادی ہوئی تھی۔ مگر سوائے عشرہ محرم اور شہجون کے کسی دن علحدہ سوائے کا افغان نہ ہوا تھا۔

آپ تو جیسے ہوں گے گریہ دل سے ہو چھپے۔ بیشک پیار کرنے کے قابل تھے۔ اس بڑھاپے میں جس وقت سوز پڑھتے تھے۔ دل لوٹ جاتا تھا۔

نہیں کو سبھی میں اوندکو کمال تھا۔ کیا جمال کوئی اوندکے سائے کا سکے۔ آچھے اچھے کوٹن کو ٹوک دیا۔ سوز خوانی میں یکتا تھے۔ سندی سوز میر علی صاحب کے اوندکو چھوٹے ہوئے تھے۔ اوندکی ملازمت سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ سبکو دن روز یاد ہو گئے۔ دُور دُور میری شہرت ہو گئی۔

خانم کی قریبہ داری تمام شہر کی دیکھ بون سے بڑھ چڑھ کے تھی۔ امام باڑے میں علم۔ پٹکے۔ شیشہ آلات۔ جوئے تھی۔ نادر تھی۔ عشرہ محرم میں دس دن تک روز مجلس ہوتی تھی۔ حاشورے کے دن سبکو دن محتاج مولک بن کی فاقہ کشی کی جاتی تھی۔ چہل تک ہر جمعرات کو مجلس ہوتی تھی۔

میری سوز خوانی مشہور تھی۔ ایسی ترکسبیں اور کسی کو کب یا دقین۔ بڑے بڑے سوز خوان میرے سائے نہ نہ دکھول سکتے تھے۔ اسی سوز خوانی کی بدولت ذاب ملکہ کشور کے محل تک میری رسائی ہوئی۔ جہاں پناہ نے خود میری فوٹو لیا کی شریف کی۔ کسر کار شاہی سے لگجو بہت کچھ ہر محرم میں عطا ہوتا تھا۔ رشید خوانان میں میرا اسم تھا۔ شب کو اپنے امام باڑے میں ماتم کر کے مجھے ارادو پر حاضر ہونا پڑتا تھا۔ کوئی دو بجے شب کو وہاں سے آتی تھی۔

جس زمانے میں بسم اللہ کی سی ہوئی تھی ذاب مجھ میں صاحب کے چچا کو بلاے معنی گئے ہوئے تھے۔ بسم اللہ کی سی کو کوئی چھپے ہوئے لڑے ہوں گے کہ وہ کہلا سے شریف لائے۔ اوندکی لڑکی کی ذاب کے ساتھ شگنی ہو چکی تھی۔ اودھون نے آنے کے ساتھ ہی شادی ڈور دیا۔ ذابصاحب بسم اللہ جان پر مرتے تھے۔ رادھر

بسم اللہ نے گھر میں بیٹھ جائے کا فقرہ دے رکھا تھا۔ صاف اٹھا کر دیا۔ مگر اٹھا کر
 جانا تک تھا۔ شاہی دمانہ ادھی لڑکی پر گالی چڑھ چکی تھی وہ کب مانتے تھے۔
 ایک شب کو لڑا ب کے مکان پر جلسہ ہے۔ مصاحبین جمع ہیں۔ بسم اللہ نواب
 کے پہلو میں بیٹھی ہیں۔ اس رات کو بسم اللہ کے ساتھ میں بھی چلی گئی تھی۔
 سامنے بیٹھی گا رہی ہوں۔ نواب صاحب طنزورہ چھڑ رہے ہیں۔ نواب کے ایک
 مصاحب خاص دلبر حسین طنزورہ بجا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک خبردار نے خبر دی
 مگر بڑے نواب صاحب (نواب صاحب کے چچا) تشریف لائے ہیں۔ نواب صاحب یہ سمجھ
 کہ آئے ہیں تو اندر محل میں بیگم صاحب (نواب صاحب کی والدہ) کے پاس چلے گئے
 اہم سب کو بھی یہی خیال تھا۔ مگر وہ ڈرانا دیوانخانے میں گھسے چلے آئے۔
 آگے جو دیکھا تو یہ جلسہ ہے۔ آگ بگولہ ہو گئے۔ خیرادیکے آئے کے ساتھ ہی گانا نواز
 ہوا۔ نواب صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔
 بڑے نواب صاحب خیراب فیض کریم کو روکے دیجئے۔ مجھے ایک امراضوری عرض
 کرنا تھا۔ ورنہ آپ کے عیش میں غل انداز ہوتا۔

نواب۔ ارشاد۔
 بڑے نواب۔ آپ بچے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں۔ میرے چھوٹے بھائی نواب
 احمد علی خان مرحوم نے والدہ مرحومہ کے سامنے انتقال کیا تھا۔ اس وجہ سے آپ
 محبوب الارث ہیں۔ کوئی حق آپ کا اس جائداد میں نہیں ہے۔ جیسے آپ فاض
 اور متصرف ہیں۔ بیشک والدہ مرحومہ نے آپ کو بیٹا کیا تھا۔ اور مرنے وقت
 آپ کے نام وصیت بھی کر گئی ہیں۔ مگر وہ کوئی چیز نہیں۔ صرف ایک نلت جائداد
 بنا براہیں وصیت نامہ کے آپ کو مل سکتی ہے۔ مگر لوگوں کے کہنے سننے سے ایسا معلوم
 ہوتا ہے کہ آپ نلت سے زیادہ صرف کر چکے ہیں۔ خیر نلت کا تجھ کو دعویٰ نہیں
 اور زیادہ کی نسبت آپ سے بارہا پرسنجھا ہوگی۔ اس لیے کہ آپ میرے خون جگر ہیں۔
 اس کے بعد بڑے نواب صاحب ابیدہ ہو گئے۔ مگر ضبط کر کے آپ اس جائداد پر
 مدت الطمر فاضل و متصرف رہتے۔ میری ذاتی جائداد میرے خرچ کے لیے کفایت کرتی
 ہے۔ اور اس جائداد کے بھی آپ ہی وارث ہوتے۔ مگر آپ کی بد وضعی نے مجھ کو جو

کتاب کو اس جائداد و موروثی سے بدخل کر دوں۔ بزرگوں کی نیک کامی حاکماری میں
 لٹانے کے لیے نہیں ہے۔ منصف الدولہ کے آدمی میرے ہمراہ ہیں۔ اسی وقت
 تمام گھر کا قبیلہ ہو گا۔ آپ فوراً مع ارباب نشاط یہاں سے تشریف لیجائیے۔
 نواب۔ تو اس جائداد میں میرا کوئی حق نہیں۔
 بڑے نواب۔ جی نہیں۔ نواب۔ اچھا ایک نلت پلے کا ستن ہوں
 بڑے نواب۔ وہ آپ لیجئے۔ اور اگر آپ کو کچھ دعویٰ ہے تو در دولت پر تشریف
 لیجائیے۔ میرے نزدیک آپ کا ایک حق نہیں ہے۔
 نواب۔ تو اچھا آمان جان کو میں اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔
 بڑے نواب۔ وہ آپ سے دست بردار ہو رہی ہیں۔ وہ میرے ساتھ کر بلا جاوے گی۔
 نواب۔ اچھا تو میں کہاں جاؤں۔
 بڑے نواب۔ یہ میں کیا جاؤں۔ یہ اپنے مصاحبین اور ملازمین اور مشورہ و مشورہ
 سے دریافت کیجئے۔

نواب۔ اچھا تو میرے کپڑے اسباب وغیرہ تو دے دیجئے۔
 بڑے نواب۔ اس مکان میں آپ کا کوئی اسباب نہیں ہے۔ نواب کے ذاتی
 خزانے ہوئے کپڑے ہیں۔
 اس کے بعد منصف الدولہ کے آدمی دیوانخانے میں چلے آئے۔ نواب صاحب کو مع
 مصاحبین دارباب نشاط گھر سے باہر کیا۔
 ہم لوگوں نے گھر سے نکلتے ہی ڈولیان کرایہ لیں۔ چوک کا راستہ لیا۔ مصاحبین
 اور نواب صاحب خداداد کے مکان گئے۔
 سنا ہے کہ مصاحبین ایک ایک کو کے راستہ ہی سے رخصت ہو گئے۔ نواب کے
 والد کا ایک قدیم ملازم مخدوم بخش جسکو نواب صاحب نے بیکار و بیکار نوکری سے برطرف
 کر دیا تھا راستے میں ملا۔ اس نے حال دریافت کیا۔ انکی بیکاری پر ترس کھا کے اپنے
 گھر لے آیا۔

نواب صاحب کے گھر آئے کے بعد شب کو بسم اللہ کے کمرے میں جلسہ ہے۔
 میان حسن و نواب صاحب کے خاص کارکن۔ مصاحب۔ دوست۔ جان نثار۔ جہان نوا

پسینا گرے دمان اپنا خون گرانے والے شریف رکھتے ہیں۔ آج ہی کچھ نہیں آئے
ہیں پہلے بھی نواب کے چوری چھپے آیا کرتے تھے۔ مگر آج کھلے خزانے بڑے غاڑ
سے بیٹھے ہیں۔ اسی وقت آپ بسم اللہ جان پر گویا بے شرکت احد سے وہ فراموش
خیر سے قابض و تصرف ہیں۔ نوکری کی گفتگو ہو رہی ہے۔

حسنو۔ دیکھو بسم اللہ جان۔ نواب سے تو اب کوئی امید نہ رکھو میں جو کچھ کہو۔ وہ
وید با کروں۔ غریب آدمی ہوں۔ زیادہ تو میری اوقات نہیں۔ جو وہ اب صاحب بچے
تھے اس کا نصف بھی مجھے ممکن نہیں۔ مگر ان کسی نہ کسی طرح آپ کو خوش رکھوں گا۔
بسم اللہ۔ غریب آدمی ہو۔ یہ نہیں کہتے کہ نواب کی دولت کاٹ کاٹ کے گھر میں
بھرنی۔ اور پھر ہم سے غریبی بیان ہوتی ہے۔ ایسے غریبوں کو نانو تو دوسرے چہلی
سے کم دیکھتے۔

میر حسنو۔ ہیں۔ ہیں۔ تم زانیہ کہو۔ وہ نواب کے پاس غامبی کیا جو میں گھر میں
بھرتی۔ کیا میری والدہ صاحبہ کے پاس کچھ کم تھا۔

بسم اللہ۔ آپ کی والدہ صاحبہ۔ بوا فرزندہ نواب سے فراز محل کی خاصہ والوں میں
تھیں نہ؟

میر حسنو۔ (چھپ کے) وہ جو کوئی ہوں۔ جب مری ہیں تو کوئی چارہزار کا تو زیور
چھوڑ کے مری ہیں۔

بسم اللہ۔ وہ آپ کی بوی سے کے بار کے ساتھ نکل گئیں۔ آپ کے پلے کیا
پڑا۔ میرے آگے ذرا بھی نہ بھاریے۔ مجھے رتی رتی حال آپ کا معلوم ہے۔
حسنو۔ تو کیا والدہ کے پاس کچھ کم تھا۔

بسم اللہ۔ والدہ آپ کے نواب مسن علیخان کے چڑیا روں میں تھے۔
حسنو۔ چڑی ما روں میں؟

بسم اللہ۔ اچھا وہ مرغازوں میں تھی۔

حسنو۔ مرغازوں میں تھے؟

بسم اللہ۔ اچھا وہ شیر باز تھی۔ تھا تو چہرہ یا کاکام۔

حسنو۔ لیجئے آپ تو مذاق کرتی ہیں۔

بسم اللہ۔ میں تو کھری کہتی ہوں۔ اسی سے مری شہر ہوں۔ اور میں کہتی بھی نہ
تھا اسے چھوڑے ہن پرچی بل گیا۔ یوں تم آتے تھے۔ میں نے کبھی منع نہیں کیا۔
آج ہی تو وہ اب پر یہ واردات ہوئی۔ آج ہی آپ نے میرے منہ در منہ نوکری کا
پنہام دے دیا۔ ہوش کی دوا کرو۔ تم کیا ذکر رکھو گے۔ یہی نہ ایک ہیمنہ۔ دو ہیمنہ۔
وہ میں ہیمنے ہی۔ بس۔

حسنو۔ چہ میمنے کی خواہجہ کر دوں۔

بسم اللہ۔ زبان سے۔

حسنو۔ یہ لو (موسے کے جڑاؤ کر کے کی جڑی کر کے کمال کے) تمہارے نزدیک
کہتے کمال ہوں گا۔

بسم اللہ۔ میں دیکھوں۔ کڑے منہ کے ہاتھ سے لکے۔ اپنے ہاتھوں میں ہیں لے
کل چٹا لے کے (اٹکے کو دکھاؤں گی۔ مگر نہ اچھے ہیں۔ اچھا نواب آپ شریف
لیجائیے۔ اسی وقت تو مجھے چھٹن باجی نے بلایا تھا ہے۔ مگر نہیں سکتی۔ کل اسی وقت
آئیے گا۔

حسنو۔ تو کڑے اوتار دیجئے۔

بسم اللہ۔ یا اللہ! کوئی چوروں سے ہوا ہے۔ میں تمہارے کڑے کچھ کھاؤں گا تو بھی
اس وقت میرے ہاتھ میں سادی بٹریاں بی ہوئی ہیں۔ امان جان سے چھپ کے جاتی ہیں
اون سے کڑے مانگوں گی تو کہیں کی کیا کرو گی۔ اسلئے ذرا ہاتھ میں ڈال لیتے۔ صبح
کو لے جانا۔

حسنو۔ کڑے وہ بیٹھے میرے نہیں ہیں۔ نہیں تو کیا بات تھی۔ چہرے سے حد تک تھی
بسم اللہ۔ تو کیا آپ کی امان کے ہیں۔ انھوں نے انتقال کیا۔ پھر ہی آپ کا مال سچ
حسنو۔ میں نے تو نہیں تعین دکھا دئے تھے۔ میرا مال نہیں ہے۔

بسم اللہ۔ جیسے میں پہچانتی نہیں۔ یہ وہی کڑے ہیں جو نواب نے اس دن میرے
ساتھ کر دی کو دیئے تھے۔

حسنو۔ تو اور سنو۔ یہ کب؟

بسم اللہ۔ جب کہ میں دن میں امر اس کے بھرے کی فرمائش ہوئی تھی۔ میں امر اس کے

ہند کی کہ بن تو رہے تو ان کی۔ (اچھے پاس خرچ نہ تھا۔ میرے سامنے معذرت چہ
بجائ کے کرے چھینک دے تھے۔) (پھر میری طرف مخاطب ہو کر)

دیکھنا بہن امراؤ یہ وہی کرے ہیں نہ؟

ہیں۔ مجھے کیا پوچھتی ہو کیا تم جھوٹ کہو گی۔؟

بسم اللہ۔ بے شک کھائے۔ اب یہ کرے آپ کو نہ دیئے جائیں گے۔ یہ ہمارے
ذواب کے کرے ہیں۔ مجھے پہچانے۔ اب ہم نہ دیں گے۔

حسنو۔ لو۔ ابھی کہی۔ اور وہ روپے جو ملے دیے ہیں۔

بسم اللہ۔ روپے تم کہاں سے لائے وہ بھی ذواب کا مال تھا۔

حسنو۔ جی جی۔ مہاجن سے بیازوہ (سودی) لاکے دیئے تھے۔

بسم اللہ۔ اچھا تو مہاجن کو بھرتیجے۔ ہم اس کو روپے دیدیں گے۔ آپ ٹہلیے۔

حسنو۔ کرے تو میں لے کے جاؤں گا۔

بسم اللہ۔ میں تو نہ دوں گی۔ حسنو۔ تو کچھ زبردستی ہے۔

بسم اللہ۔ جی ہاں زبردستی ہے۔ لے اب بچکے سے کھسک جائے نہیں تو۔۔۔

حسنو۔ اچھا تو رہنے دیجئے۔ کل ہی ویہ بیگے گا۔

بسم اللہ۔ کل دیکھا جاوے گا۔

دیکھا جاوے گا۔ بسم اللہ نے اس توہے کہا کہ میان حسنو کو بچکے سے اوٹھ کے چلے

جاتے ہی بن پڑی۔

بات یہ تھی کہ ذوالصاحب کے چپانے جب جھپن صاحب کے نوکر دن سے

صاحب نہیں کی ہے اس وقت جس قدر اسباب جس جس کی معرفت تھا اس کو سود

اور اصل کا روپیہ دے کے چھڑوا لیا۔ حسنو سے اس کرے کی جوڑی کے لیے جب

باز پرس ہوئی تو یہ صاف نہ کر گیا کہ میری معرفت کر دی نہیں ہوے۔

اسی سے میان حسنو کی کوریجی تھی۔

بسم اللہ۔ (حسنو کے چلے جانے کے بعد مجھے) دیکھا بہن یہ بڑا فاجو جی ہے۔

ذواب کا کچھ ایسی موزی نے ہمیں نہیں کیا۔ میں مدت سے اس ٹوٹے کی ناک میں

تھی۔ آج ہی داؤد کی پرچھا ہے۔ یہ کرے میں اس کو بک دیجی ہوں۔ کوئی کیا سکتا

چوری کا تو مال ہے۔

ہیں۔ ہرگز نہ دینا۔ دینا ہے تو ذواب کو دیدو۔ احسان ملی ہو گا۔

بسم اللہ۔ ذواب کو بھی نہ دوں گی۔ بہن کیا وہ سو کی جوڑی ہے۔ ٹوٹے سے مواد دو

پرتھالی تھی۔ زیادہ رہن نیست۔ سودا سو حوالے کر دیں گی۔ دن میں سود کے ہی

ہیں۔ جلا مہاجن نہیں کیوں دینے لگا۔

بسم اللہ۔ کیسا مہاجن۔ اسی نے روپے دیئے تھے۔ اور جب بڑے نوٹ نے

پوچھا تو کیسا لگ گیا۔ اور اگر یہ کچھ زیادہ ٹھیک کر سیکے تو ایک نوٹ کی جوڑہ دکھاؤ گی

ابھی یہ بائیں پوری رہی تھیں کہ ذوالصاحب تشریف لائے۔ پاپا ہوا۔ آئیلے۔

چہرے پر اور اسی چھائی ہوئی۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے۔ تہہ شان زدہ

شوکت۔ نہ وہ دعب داب نہ وہ بے کلفی۔ بچکے آکے اک کنارے چلے گئے۔

سچ کہوں۔ میری تو آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ مگر بن نے اپنے کو ضبط کیا۔ مگر وہ

ہی بسم اللہ رنڈی ہو نو ابھی ہو۔ آنے کے ساتھ ہی کر دیں کا ہتھہ چھیر دیا۔

بسم اللہ۔ ذواب دیکھو یہ وہی کرے کی جوڑی ہے نا۔ جو مجھے اس دن حسنو کو

گر دی کرنے کو دی تھی۔

ذواب۔ وی ہیں۔ یہ تو لگ گیا تھا کہ میرے ماتون کر دی نہیں ہوے۔

بسم اللہ۔ کتنے پر گردی ہوے تھے۔

ذواب۔ یہ تو یاد نہیں۔ شاید ڈھائی سو یا سواد سو۔ کچھ ایسے ہی تھے۔

بسم اللہ۔ اور سود کیا تھا۔

ذواب۔ سود کا حساب کس نے آجک لیا۔ جو چیز کر دی ہوئی۔ پھر اس کے کبھی

چھڑانے کی نوبت نہیں آئی۔ جو سود کا حساب کیا جانا۔

بسم اللہ۔ اچھا تو یہ کرے میں لے لیں۔

ذواب۔ لے لے۔

بسم اللہ۔ کہو تو میان حسنو کو ذوالصاحب کے پاس بھجوں۔

ذواب۔ بہنیں۔ میرے سر کی قسم ایسا نہ کرنا۔ سید ہے۔

بسم اللہ۔ سید ہے۔ اس کے باب کا پتہ نہیں۔

ذواب غم وہ تو اپنے منہ سے کہتا ہے۔
 میں اپنے دل میں ذواب کی بہت پرافزین کرنے لگی۔ واہ ری بہت کیا کہنا۔
 خاندانی رئیس ہیں نہ۔

بسم اللہ کی بے مروتی دیکھئے۔ ذواب سے وہی چٹن جان کے گھر جانے کا
 پہانہ کر کے اذکو سویرے سے رخصت کروایا۔ خدا جانے کس سے وعدہ تھا۔
 اس واقعے کے دوسرے یا تیسرے دن کا ذکر ہے۔ میں خاتم صاحب کے پاس بیٹھی
 ہوئی ہوں۔ اپنے من ایک بڑھی سی عورت آئی۔ خاتم صاحب کو جھک کے سلام
 کیا۔ خاتم نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سامنے بیٹھ گئی۔
 خاتم کہان سے آئی ہو۔

بڑھیا۔ کیا بتاؤں۔ کہان سے آئی ہوں۔ کوئی ہے تو نہیں۔ کیوں؟
 خاتم۔ بواہان کون ہے؟ میں ہوں۔ تم ہو۔ اور یہ چھوڑی ہے۔ اسکو بات
 سمجھنے کی قیہ نہیں۔ کہو۔

بڑھیا۔ مجھے ذواب فخر النسا بیگم صاحب نے بھیجا ہے۔

خاتم۔ کون فخر النسا بیگم صاحب؟

بڑھیا۔ اسے لوٹم پدین جانیئیں۔ ذواب چٹن

خاتم۔ سمجھی۔ کہو۔

بڑھیا۔ بیگم صاحب نے مجھے بھیجا ہے۔ آپ بسم اللہ جان کی مان ہیں نہ۔

خاتم۔ مان۔ بات کہو۔

بڑھیا۔ بیگم صاحب نے کہا ہے کہ چٹن صاحب میرا اکلوتا لڑکا ہے۔ میں بھی آپ پر
 پروانہ ہوں۔ اور اوسکا باپ بھی پروانہ تھا۔ میرے نازوں کا پالا ہے۔ اور اوسکا
 چچا بھی دشمن نہیں ہے۔ اپنی اولاد سے بڑھ کے سمجھتا ہے۔ اُسکے بھی ایک
 اکلوتی لڑکی ہے۔ چٹن کی منگین۔ لڑکی پرگالی چڑھ چکی ہے۔ چٹن نے شادی
 کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی پر چچا کو برا معلوم ہوا۔ میں نے بھی دخل نہیں دیا۔ یہ ب
 تیبہ کے لیے بکا گیا ہے۔ شادی لڑکی کا عمر ہر کا گھر ہے۔ جو خواہ لڑکا دینا تھا۔ اس سے
 دس اوپر مجھے لینا۔ مگر اپنا احسان چھڑ کر وہ شادی بردار مری کردو۔ شادی کے بعد

سب جا ملاد اوسی کی سے سو اور سکے اور سے کون۔ میری اور چچا کے جان ڈال
 سکا ملک ہے۔ مگر اپنا خیال رکھو کہ یہ گھر تباہ ہونے پائے۔ اس میں ٹھہرا بھی جلا
 اور ہمارا بھی۔ اسلئے ہنکو اختیار ہے۔

خاتم۔ بیگم صاحب کو میری طرف سے آداب نیلماں کہنا۔ اور عرض کرنا کہ جو کچھ آپ نے
 ارشاد کیا ہے خدا جا ہے تو وہی ہوگا۔ میں آپ کی عمر بھر کی لونڈی ہوں۔ مجھے
 کوئی امر غلات ہوگا۔ خاطر جمع رکھیے۔

بڑھیا۔ مگر بیگم صاحب نے کہا ہے کہ چٹن کو اسکی خبر نہ ہو۔ بڑھادی لڑکا ہے۔ اگر
 کہیں معلوم ہو گیا تو ہرگز نہ مانے گا۔

خاتم۔ (ماسے) کیا حال۔ (مجھے) دیکھ چھوڑی کہیں کسی سے یہ قصہ نہ لے
 جیٹنا۔

میں۔ جی نہیں۔

اسکے بعد بڑھیا نے علیحدہ لہجہ کے خاتم سے پیکی پیکی باتیں کیں۔ وہ میں نے
 نہیں سنیں۔ اماں کے رخصت کے وقت خاتم کو اپنا کہتے سنا۔

خاتم۔ "میری طرف سے عرض کرنا کہ اسکی کیا ضرورت تھی۔ ہم لوگ تو قدیمی نکلواڑی

بڑھیا کے جانے کے بعد خاتم نے بسم اللہ کو بلا بھیجا۔ اور کچھ ایسے دو انچھ کران میں
 پھونک دیے کہ اب جو نوا اچھا آئے تو وہ آؤ جھگت ہوئی کہ ملازمت کے زمانے
 میں بھی کبھی نہ ہوئی تھی۔ نوا اچھا جیسے ہیں۔ بسم اللہ سے انتظار کی باتیں ہو رہی
 ہیں۔ میں بھی موجود ہوں کہ اتنے میں خاتم صاحب خود بسم اللہ کے کمرے کے دروازے
 پر جا کے کھڑی ہوئیں۔

خاتم۔ اسے لوگو ہم بھی آویں۔

بسم اللہ۔ (لو اب سے) داسرک بیٹو۔ رانا آتی ہیں۔ (خاتم سے) آئیے۔

خاتم نے سامنے آئے ہی لو اب کو تین سیلین کیں۔ میں نے آج کے دن کے سوا
 خاتم کو اس طرح مودب ہو کر کسی کو سلام کرتے نہ دیکھا تھا۔

خاتم۔ ذواب سے حضور کا خراج کیسا ہے۔

نواب - گردن بھٹکا کے - الحمد للہ۔

خاتم - خدا خوش رکھے - ہم لوگ تو عاگوہین - ہزار ہر جہ جاین - مگر پھر می دی
کے کی مالوادی آپ کے ہاتھ کے دیکھنے والی - آپ کو خدا نے نہیں کیا ہے۔
اس وقت ایک عرض نے کے حاضر ہوئی ہوں - یوں تو بسم اللہ خدا رکھے سال بھر
آپ کی خدمت میں ہیں - گریز میں نے کبھی آپ کو کھات نہیں دی - بلکہ حضور کے سلام
کو بہت کم حاضر ہونے کا اتقان ہوا ہوگا - اس وقت ایسی ہی ضرورت تھی جو جلی آئی۔
خاتم - تو یہ باتیں کر رہی ہیں - بسم اللہ اذ بکا نہ دیکھ رہی ہیں کہ یہ کہتی کیا ہیں - میں
کسی قدر بات کا پہلو سمجھنے ہوئے تھی - نواب کی طرف دیکھ رہی ہوں - نواب کیا ہے
حال ہے کہ چہرے سے ایک رنگ جاتا ہے اور ایک آتا ہے - بگاہیں چھپی جاتی ہیں مگر
پچکے بیٹھے ہیں۔

خاتم - تو مجھ پر عرض کروں
نواب (بہت ہی مشکل سے) کہے۔
خاتم - ذرا بواہی سنیں تو بھلا لیں۔
میں گئی - بواہی سنیں تو بھلا لائی۔

خاتم - (بواہی سے) "بواہی وہ دو شاہے کی جوڑی تو ادھٹا لانا۔" وہی جو کل
بچنے کو آیا ہے۔

"بچنے کو آیا ہے" ان لفظوں نے نواب پر وہی اثر کیا - جیسے کسی پر دفعہ عجلی
گر پڑے۔ مگر بہت ضبط کر کے پچکے بیٹھے رہے۔ اتنے میں بواہی سنیں دو شاہے کے آئین
کیسا بڑا متن و کار دو شاہے کو بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

خاتم - (نواب کو دو شاہے دکھا کے) دیکھیے یہ دو شاہے کل بچنے کو آیا ہے۔ سو داگر
دو ہزار کتا ہے - ہندو تو تک لوگوں نے گلا دے ہیں - وہ نہیں دیتا - میری بکاہ میں
سہرہ - بلکہ اٹھارہ تک ہر گناہ میں ہے - اگر حضور پرورش کریں تو بھلا اس بڑے صاحب
میں آپ کی بدولت ایک دو شاہے نوادر تھو لون۔

نواب خدا خوش بیٹھے رہے - بسم اللہ کچھ بولا ہی جاہتی تھیں کہ خاتم نے جہلک کے کہا
خاتم - شہر لڑکی - تو ہمارے چچ میں نہ ہوا - تو آئے دن فرمائشیں کیا کرتی ہے۔

ایک فرمائش ہماری بھی سہی۔
نواب پھر پچکے بیٹھے ہیں۔

خاتم - ادھی نواب صاحب - سخی سے موم بھلا - جو جلدی دے جواب - کچھ تو
ارشاد کیجئے - سکوت سے نو بندی کی تنگیں بڑھتی ہیں - بان لگ رہی ہیں - ہین - سہی۔
کچھ تو کہہ دیجئے - میرے دل کا ارمان تو کھل جائے۔
نواب اب بھی چپ ہیں۔

خاتم - لہذا حضور - جواب دیجئے - یوں تو میری تعقیقت ہی کیا ہے - موی بازار کی کبی
مگر آپ ہی لوگوں کی غرت دی ہوئی ہے - ہر اسے خدا ان چوکریوں کے سامنے
تو بچہ بڑھیا کو ذلیل نہ کیجئے۔

نواب - (آبدیدہ ہو کر) خاتم صاحب - اس درشتاے کی کوئی اصل نہیں ہے۔
مگر تمکو میرا مال غایب معلوم نہیں - کیا بسم اللہ جان نے کچھ نہیں کہا - اور بان امراد
بھی تو اوس دن تھیں۔

خاتم - مجھے کسی نے بھی کچھ نہیں کہا - کون نمبر نو سے؟

بسم اللہ پھر کچھ بولنے کو تھیں - خاتم نے آنکھ کا اشارہ کیا - وہ چپ ہو رہیں۔
ہال کے اوپر اوپر دھرو کیجئے لگیں - میں پہلے ہی سے بت ہی چھپی ہوئی تھی۔
نواب - اب ہم اس لائق نہیں رہے جو آپ کی فرمائشوں کو پورا کریں۔

خاتم - آپ کے دشمن اس لائق نہ رہے ہوں - اور میں ایسی چھجھری نہیں جو روز
فرمائشیں کیا کروں - فرمائش کریں نہ کریں - بسم اللہ کریں - بھلا میں بڑھتی آؤمی
میری فرمائشیں کیا - اور میں کیا - یہ کہہ کے خاتم نے ایک آہ سرد دھری۔

خاتم - بڑے تقدیر! اب ہم اس لائق ہو گئے کہ ایسے ایسے رئیس ایک خدا سے
چیتھڑے کے بیٹے ہم سے منہ چپاتے ہیں۔

میں دیکھ رہی تھی کہ خاتم کا ایک ایک فقرہ نواب کے دل پر نشتر کا کام دے رہا تھا
نواب - خاتم صاحب آپ سب لائق ہیں - میں سچ کہتا ہوں اب میں اس لائق
نہیں رہا - جو کسی کی فرمائش پوری کروں - اب کے بعد نواب نے اپنی تباہی کا غصہ طرا
خاتم - خیر میان اس لائق تو آپ نہیں رہے کہ ایک ادنیٰ سی فرمائش پوری کریں مگر

ہیں دانے کے جو تھے پانچویں دن چھین صاحب کے اٹھ کی ایک انگوٹھی نکال
 میں بچتی ہوئی پکڑی گئی۔ بیچنے والے کو علی رضا ایک کو تو مال کے پاس لے گئے۔
 اوسے کہانے امام بخش ساتی کے لئے بیچنے کو دی ہے۔ امام بخش ساتی کا رکھ
 نو نہ لا۔ خود امام بخش پکڑ لایا گیا۔ پہلے تو امام بخش صاف کر گیا کہ میں اس انگوٹھی
 کو نہیں جانتا۔ آخر جب نرے غریب ڈانٹا۔ تو قبول دیا۔
 امام بخش حضور میں لب دریا لوسے کے پل کے پاس تھ پلٹا ہوں۔ جو لوگ دیا
 نہاتے جاتے ہیں اور ان کے کپڑوں کی رکھوالی کرتا ہوں۔ پانچ دن کا ذکر ہے ایک
 شریف زادے کوئی بیس برس کی عمر ہوگی۔ گورے۔ گورے سے خستہ بہت
 خوبصورت فرماں۔ سر شام کچے پل پر نہانے آئے۔ کپڑے اذمار کے میرے پاس
 رکھوائے۔ مجھے تنگی۔ تنگے باندھی۔ خود دریا میں کود پڑے۔ غوطی در تک نہایا کینے
 پھر میری نظر سے او قیل ہو گئے۔ اور سب لوگ دریا سے نہانے کے نکلے۔ کپڑے بہن بہن
 کے اپنے گھر دن کو روانہ ہو گئے۔ وہ صاحب نہ آئے۔ میں یہ سمجھا کسی طرف پیرتے
 ہوئے نکل گئے ہوں گے۔ بڑی دیر ہو گئی۔ میں اس آسے کہ میں اب آئے ہوں۔
 اب آئے ہوں۔ ہر بھرات گئے۔ تک بیٹھا رہا۔ آخر کو مجھے نصیب ہو گیا کہ دُوب گئے
 اب میں دل میں یہ سوچا کہ اگر کسی کو خبر کرتا ہوں تو جھگڑوں میں پھنس جاؤں گا کچھنا
 کچھنا پھر دن کا۔ اس سے بہتر ہے کہ چپ ہو رہوں۔ اور ان کے کپڑے اذمار کے گھر پر
 لے آیا۔ جب میں سے یہ انگوٹھی نکلی۔ اور ایک اور انگوٹھی ہے اور میں خدا باپ نے
 کیا لکھا ہے۔ میں نے اسے ڈر کے آج تک کسی کو نہیں دکھائی۔ میں تو اس انگوٹھی
 کو بھی نہ بیچتا۔ مگر نرا رکھنا ختم ہو گیا ہے۔ وہ چڑا کے لے آیا۔
 مرزا علی رضا ایک دوسرا ہی کو زالی سے ساخہ کیے۔ وہ انگوٹھی اور کپڑے اور
 گھر سے نکلوائے۔ انگوٹھی ہر کی تھی۔ مرزا علی رضا ایک نے بڑے ذرا صاحب کو اس
 ساخے کی خبر کی۔ کپڑے اور دونوں انگوٹھیاں گھر پہنچا دیں۔ امام بخش کو سزا ہو گئی
 بسم اللہ۔ ا۔ آخر ذرا اب چھین صاحب دُوب گئے نہ ہیں تو سچ کہوں۔

اٹان جان کی گردن پر اذکار کا خون ہوا۔
 میں۔ افسوس! میں فرادی دن دل میں کشاکش گئی تھی۔ اسی لیے اوس دن اُنکے
 ساتھ اوسھی تھی کہ کچھ سمجھا تجھ دون۔ گردہ زینے سے اوتاری گئے۔
 بسم اللہ۔ اور ان کے سر پر نساوا تھی۔ خدا غارت کرے بڑے ذرا اب کو۔ نہ اذکار
 جانا دے بے من کرتے نہ وہ اپنی جان دینے۔
 میں۔ خدا جانتے مان کا کیا حال ہوا ہوگا۔
 بسم اللہ۔ سنا ہے بچاری دیوانی ہو گئی ہیں۔
 میں۔ جو نہ ہو۔ کم ہے۔ یہی تو ایک اللہ آئین کا لٹکا تھا۔ ایک تو بچاری راہ پر وہ
 دوسرے یہ آفت۔ اور ان کے سر پر ٹوٹ پڑی۔ سچ پوچھو تو اذکار گھر ہی تیار ہو گیا۔
 رسوا۔ تو ذرا اب چھین صاحب کو اپنے ڈوبی دیا۔ اچھا میں موتے پر ایک
 بات مجھے پوچھ لینے دیجئے۔
 امراؤ۔ پوچھئے۔
 رسوا۔ ذرا صاحب میرا جانتے تھے یا نہیں۔
 امراؤ کیا معلوم۔ یہ آپ کیون پوچھتے ہیں اب۔
 رسوا۔ اسلئے کہ مجھے میری بھلی صاحب نے ایک نکتہ بتایا تھا کہ جو شخص میرا
 جانتا ہے وہ اپنے قصد سے نہیں دُوب سکتا۔

کچھ اور نکلا امتحان وفا سے غرض تھی
 اک زار و نا توان کے ستارے سے کام تھا

مرزا رسوا صاحب آپ کو کسی سے کبھی عین ملی ہوا ہے۔
 رسوا۔ جی نہیں۔ ضائع کرے۔ آپ کو تو سب کو دن سے عین ہوا ہوگا۔ آپ اپنا حال
 کہئے۔ اسی ہی بائیں سننے کے توہم نشان ہیں۔ مگر آپ کہتی ہی نہیں۔
 امراؤ۔ دن تو سب راہ مٹی کا پیشہ ہے۔ اور یہ ہم لوگوں کا چلنا ہوا فقرہ ہے۔
 جب کسی کو دم میں فنا جاتے ہیں۔ اور سہارے لگتے ہیں۔ ہم سے زیادہ کسی کو
 مرزا نہیں آتا۔ مٹتی سانسین جہنا۔ بات بات پر دُوب دینا۔ دُوب دُوب کھانا کھانا

کوئین میں پاؤں لٹکا کے بیٹھ جانا۔ سنکھیا کھانا یہ سب کچھ کیا جاتا ہے کیسا ہی سخت دل کا آدمی کیوں نہ ہو۔ ہمارے قریب میں آئی جانا ہے۔ گوئین آپ کے بیچ پہنچی ہوں کہ نہ مجھے کسی کو عیش ہو۔ اور نہ مجھ کو کسی سے۔ البتہ بسم اللہ جان کو فقہاری میں بڑا ملکہ تھا۔ انسان نور انسان۔ فرشتہ اون کے جل سے نہیں نکل سکتا تھا۔ ہزاروں ان کے عاشق تھے۔ اور وہ ہزاروں پر عاشق حسین۔ سچے عاشقوں میں اب مولوی صاحب قبلہ کا چہرہ بھی تھا۔ ایسے ویسے مولوی نہ تھے۔ عربی کی اونچی اونچی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ دور دور سے لوگ اون سے بڑھنے آتے تھے۔ مقولات میں اون کا مثل و نظیر نہ تھا۔ جس زمانے کا میں ذکر کرتی ہوں بن شریف شہر سے کچھ ہی کم ہوگا۔ نوزائی چہرہ۔ سلبہ دار صبی۔ سر ٹنڈا ہوا۔ اوپر ہر عامہ۔ عبات شریف۔ عصابے مبادک۔ اونچی صورت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ ایک چمپی بوی۔ شوخ۔ ذوقان و نڈی پر عاشق ہیں۔ اور اس طرح عاشق ہیں۔

ایک دن کا واقعہ عرض کرتی ہوں۔ اسپین کسی طرح کا سال اللہ سمجھئے۔ بالکل صحیح صحیح ہے۔ آپ کے دوست۔۔۔ میر صاحب قبلہ مرحوم جنکو دلبر جان سے ظن تھا۔ خود شاعر تھے۔ اور عمدہ اشعار پر دم دیتے تھے۔ اسی سلسلے میں حسن پرستی کا بھی شوق تھا مگر نہایت ہی مغولت کے ساتھ شہر کی وضعیت اور بیرون میں کون ایسی قبی جان وہ نہ جانتے ہوں۔

رسوا۔ جی ہاں کہیے۔ میں خوب جانتا ہوں۔ خدا دیکھے درجات عالی کرے! امر او۔ وہ بھی اوس موقع پر موجود تھے۔ شاید آپ کو یاد ہو بسم اللہ جان غلام سے لڑکے کچھ دھڑن کے لیے اوس مکان میں جا رہی تھیں۔ جو بازار سے کچھ پورے

رسوا۔ بن اوس مکان پر کبھی نہیں گیا۔ امر او خیر۔ مگر بسم اللہ کے دیکھنے کے لیے اور اس غرض سے بھی کہ ان بیٹوں میں لا بہرہ اور نہ۔ اگشتہ جابا کرتی تھی۔ ایک دن قریب شام صحن میں تخون کے چوکے پر گاؤسے لگی ٹپھی ہیں۔ میر صاحب (مرحوم) اون کے قریب مشرف رہتے ہیں۔ مولوی صاحب قبلہ سامنے دو درہند بٹھے ہوئے ہیں۔ اوس وقت کی اندھی بھیجی

صورت مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ زیتون کی تسبیح پر پچکے چپکے (شاید) یا خفیہ یا غیبی پڑھ رہے ہیں۔ میں جو مٹی تو بسم اللہ نے! تیرے چوکے مجھے برابر بچایا۔ میں میر صاحب اور مولوی صاحب کو تسلیم کر کے بیٹھ گئی۔ بسم اللہ نے پچکے سے میرے کان میں ہاں تھا۔ تماشا دیکھو گی۔

میں۔ (حیران ہو کر) کیا تماشا؟

بسم اللہ۔ دیکھو۔ یہ کہہ کے مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوئیں۔ مکان کے صحن میں ایک بہت پرانا نیم کا درخت تھا۔ مولوی صاحب کو حکم ہوا۔ اس درخت پر چڑھ بھاؤ۔

مولوی صاحب کے منہ پر ہوا بیان اور نے لگیں۔ غر غر کانپنے لگے۔ میں زمین میں گڑی جاتی تھی۔ میر صاحب منہ پھیر کے بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب پیارے کبھی آسمان کو دیکھتے تھے۔ کبھی بسم اللہ کی صورت کو۔ وہ ان ایک حکم کر کے دُورا حکم چھو پٹا اور فوراً۔ قیس زواری کی حکم، چڑھاؤ کہتی ہوں۔

اب بن نے دیکھا کہ مولوی صاحب بسم اللہ کہہ کے اڑ گئے۔ عبات شریف کو غبون کے چوکے پر چھوڑا۔ نیم کی چڑ کے پاس کھڑے ہوئے۔ پھر ایک تریب بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اوسے ان ذرا چین چین ہو کے کہا۔ "ہوں!" مولوی صاحب پانچے چڑھا کے درخت پر چڑھنے لگے۔ خود ہی دور یا کر بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اس دیکھنے کا شاہرہ یہ مطلب تھا کہ بس یا اور۔

بسم اللہ۔ اور۔

مولوی صاحب اور چڑھے۔ پھر انتظار کا حکم کیا۔ پھر وہی اور اس طرح درخت کی چٹنگا کے پاس بھونچ گئے۔ اب اگر اور اوپر جاتے تو شاید زمین اور قدرتی حسین کی ضرورت ہی گر پڑنے۔ اور جان جن تسلیم ہو جاتے۔ بسم اللہ کی زبان سے اور نکلنے کی کو تھا کہ بن قدنون پر گر پڑی۔ میر صاحب نے نہایت بہت کے ساتھ سفارش کی۔ اسے حکم ہوا اور اتر آؤ۔ مولوی صاحب چڑھے تو چڑھ گئے۔ مگر اوزر نے بن بڑی ہفت ہوئی۔ مجھے ذرا سا معلوم ہوتا تھا کہ اب گرے اور اب گرے۔ مگر چڑھنا اور آئے۔ پیارے پسینے پسینے ہو گئے۔ دم بھول گیا۔ قریب تھا کہ گر پڑیں۔ مگر اپنے ہاتھ

سبھال کے غلین ہن کے تخت کے قریب آئے۔ عمامے مبارک قریب دہن کیا۔ چپکے چپکے بچہ بڑھنے لگے۔ بچہ دھکے دے لگے مگر کسی پہلو سے مار نہ تھا چپہ ازار خیریت میں گھس گئے تھے اس سے بہت ہی پریشان تھے۔
 رسوا۔ جی داند بسم اللہ بھی جب دل لگی باز پڑی تھی۔
 امرا کو دل لگی کا کیا ذکر ہے۔ وہ بیدار چپکے بیٹھی تھی۔ بسم کا ان بھی چہرے پر نہ تھا۔ میں اور میر صاحب دونوں دم بخود بیٹھے تھے۔ ایک عجیب عالم جبرت طاری تھا۔

رہے گا کیون کوئی طرز رستم بانی دمانے بن
 مزا آنا ہے اس کا ذکر اعلیٰ آمانے بن

رسوا۔ یہ جلد عمر بھر نے کے لیے کافی ہے۔ قصور شرط ہے۔ تم نے زبان کیا اور میری آنکھوں کے سامنے۔ بسم اللہ مولوی صاحب۔ اور اونکی تقدیر صورت میر صاحب۔ تم۔ سخن کا درست۔ ان سب کی تصویریں کھینچ لی گئیں۔ یہ تو کچھ ایسا واقعہ ہے کہ دفعتاً ہنسی بھی نہیں آتی۔ اچھا غور کر لوں تو ہنسون۔ نا صاحب مجھے ہنسی نہیں آتی۔ مولو صاحب کی حماقت پر دونا آتا ہے۔ بے شک بسم اللہ قیامت کی زبانی تھی۔ ستر برس کا بڑھا اوس پر حکم۔ درست پر چڑھی آؤ اور وہ بھی چڑھ گئے۔ میری تو کچھ سمجھ نہ نہیں آتا۔ بڑا دھن مسئلہ ہے۔ امراؤ۔ دانی آپ نہیں سمجھ سکتے۔ آپس قیامت کی باریکی ہے۔ آخر بیان ہی کرنا پڑا۔

رسوا اللہ جان کچھ۔ کیا ابھی کچھ اور نصیحت باقی ہے۔

امراؤ۔ ابھی بہت سی نصیحتیں باقی ہیں۔ مے سینے۔

مولو صاحب کے جانے کے بعد میں نے بسم اللہ سے پوچھا تھا۔

میں بسم اللہ۔ یہ تجھ کو ہوا کیا تھا؟۔ بسم اللہ کیا؟۔

میں۔ ستر برس کا بڑھا۔ اور جو درست پر سے گر پڑا تو مفت خون ہوتا۔

بسم اللہ۔ ہماری بلا سے خون ہوتا۔ میں تو اس مومے کو بیکے جلی ہوئی تھی کل میری دھن کو اس زور سے دے پٹھا کہ ٹی ہلی ٹوٹ گئی ہوتی۔

بات یہ تھی کہ بسم اللہ جان نے ایک بندیا پالی تھی اسکا بڑا گھرا سہاگ تھا۔ فدا اوسکے ٹھاٹھ سن بیٹھے۔ اطللس کی گھنگریا۔ کاما لئی کی کرتی۔ جالی کی اچھی پاندی کی چوڑیاں۔ طون۔ گھنگرو۔ سونے کی بالیاں۔ جلیبیاں۔ ارمیان۔ کھانے کو۔ باب مولی تھی۔ تو تونی ذرا سی تھی۔ دھن برس میں کھا کھا کے خوب موٹی ہوئی تھی۔ جو لوگ جانتے تھے۔ وہ تو خیر۔ آجی آدمی پروفندہ پارٹے تو کھلمی بندھ جاسے۔ زور بھی اٹھا تھا کہ اچھے مرد کا ناٹھ پکڑے تو پھر اسے نہ چھوئے۔

جس دن مولوی صاحب نیم پر چڑھائے گئے ہیں۔ اس سے ایک دن پہلے کا ذکر ہے کہ آپ تشریف لائے۔ قتل کے جو کچھ رہے تھے۔ بسم اللہ جان کو سخران سوچا۔ دھن کو اشارہ کیا۔ وہ پشت سے چپکے چپکے آئی۔ اور آپ کے مولو صاحب کے کندھے پر جا بیٹھی۔ مولو صاحب نے جو کچھ دیکھا۔ بچارے کچھ اسکے۔ زور سے جھٹک دیا۔ چخت کے نیچے گر پڑی یا میں تو بانی برن خود ملی گئی ہوگی۔ مولوی صاحب پر کھم کھمائے لگی۔ مولو صاحب نے لاٹھی دکھائی۔ وہ دھکے بسم اللہ کی گود میں جا بیٹھی۔ بسم اللہ نے اسے تو جیکار ڈوپے کا پل اوڑھا دیا۔ اور مولو صاحب کو خوب دل کھول کے کوسا کا لیاں دین پس پڑی جبر آیا۔ دوسرے دن۔ بسم اللہ جوڑی۔
 رسوا۔ مزا مناسب تھی۔

امراؤ۔ مناسب ترین تو کوئی شک نہیں۔ مولو صاحب کو کھٹکے کا ٹکڑا بنا دیا۔

رسوا۔ دانی مولوی صاحب کوئی خدیر تو تھے۔ نیس نے تو سب بلی کو پیار کر کے گود میں اوٹھا لیا تھا۔ اور مولو صاحب نے بسم اللہ جان کی چاہتی بندیا کو ادل تو جھٹک دیا۔ پھر۔ بے ادبی کی کہ اسے لاٹھی دکھائی۔ عشن کی نشان سے بہت لیدھا۔

ایک دن رات کے آٹھ بجے بسم اللہ جان کے کمرے میں ہون بسم اللہ جان کا رہی ہیں۔ میں لٹنرہ چھپر ہی ہون۔ غلطہ جی طبلہ بچارے ہیں۔ ایسے میں مولو بیٹا تلب

تشریف لائے۔
بسم اللہ۔ (دیکھتے ہی) برآمدہ دن سے آپ کہاں تھے۔
 مولوی صاحب۔ کیا کہوں۔ مجھے تو ابھی ایسی تیر شد بہ لائق ہوئی تھی کہ بچنا چاہا تھا۔ مگر تمہارا دیوار دیکھنا تھا اس لیے جاتا سر گیا۔
بسم اللہ۔ تو یہ کیسے۔ وصال ہو گیا ہوتا۔
 اس فقرے نے جھکو اور غلطی کو غصہ کر دیا۔
 مولوی صاحب۔ جی ہاں ہمارے تو کچھ ایسے ہی تھے۔
بسم اللہ۔ واللہ اچھا ہوتا۔
 مولوی صاحب۔ میرے مرنے سے آپ کا کیا نفع ہوتا۔
بسم اللہ۔ جی آپ کے غم میں ہر سال جا با کرتے۔ گاتے۔ ناچتے۔ لوگوں کو رجماتا۔ آپ کا نام روشن کرتے۔
 اسی طرح کی چند باتوں کے بعد پھر گانا شروع ہوا۔ **بسم اللہ** نے حسبِ وقت یہ غزل شروع کی۔
 مرنے مرنے نہ قضا یاد آئی * اوی کا نسہ کی ادا یاد آئی
 مولوی صاحب بروہد کی حالت طاری تھی۔ آئندہ دن کا نار بندھا ہوا تھا۔ قطرے ریشِ مقدس سے ٹپک رہے تھے۔ ارٹنے بن سامنے والا دروازہ کھلا۔ ادایک تھا جوان۔ گندی رنگ۔ گول چہرہ۔ سیاہ وار تھی۔ میانہ قد۔ کثرتی بدن۔ جا دانی کا انگ کہ۔ بھٹنا بھٹنا پہننے۔ بڑے پاتھوں کا پا جامہ۔ نچلی جوتہ۔ نہایت عمدہ۔ پانی کی چکن کا رد مال اور بے بوسے داخل ہوئے۔ **بسم اللہ** نے دیکھتے ہی کہا۔ واہ مٹا اوس دن کے گئے گئے آج آپ آئے بے بس شیلے ہیں ایسی آشنا فی نہیں رہتی۔
 اور وہ لال طانی گزٹ کے طاتے کہاں ہیں۔ اسی سے تو آئے مٹے چپا یا۔
 وہ صاحب۔ دلچاسمت کے لمحے ہیں (ہنیں کسے کار یہ بات نہیں)۔ اوس دن مجھے فرصت ہی نہیں ملی والدہ کی طبیعت بہت علیل تھی بن اونچی بیمار داری میں تھا۔
بسم اللہ۔ جی ہاں آپ ایسے ہی سادہ منہ ہیں۔ مجھے نہیں ہے۔ نہیں کہنے

کہ آجکل بن کی چھو کر ہی پر آپ فریغ اور رات کو دہن کی دربار داری ہوتی ہے۔
 مجھے سب خبریں ملتی ہیں۔ اور ہم سے فقرے ہوتے ہیں کہ والدہ کی طبیعت علیل تھی۔ اس آواز کو سننے ایک مرتبہ مولوی صاحب نے مجھے مڑے دیکھا۔ ابھی اور کئی چار اکھین ہوئیں۔ مولوی صاحب نے فوراً نہ پھر لیا۔
 دوسرے صاحب کو جو دیکھتی ہوں تو میرے کا رنگ تبصر ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں خستہ تر کا بنے گئے۔ دباہی سے دروازہ کھول کر سے کے بچے تھے۔ **بسم اللہ** پکاری کی پکاری رہی اور عین نے جواب تک نہ دیا۔
بسم اللہ بھی کچھ مجھ کے پہلے تو چپ سی ہو گئی۔ مگر پھر ایک ہی مرتبہ توری چڑھا آپ ہی آپ کہنے لگی دو تیر یا شدہ "اُنّا کہہ کے گاتے میں مصروف ہوئی۔
 اوس دن کے بعد میں نے اُن کو بھی **بسم اللہ** کے پاس آئے نہیں دیکھا۔ مولوی صاحب برابر آیا کیسے۔
 رسوا۔ جی ہاں اُنکے زمانے کے لوگ ایسے وہی دغما ہوتے تھے۔
 گھانا ہو ہی رہا تھا کہ گوہر مرزا شاید یہ سننے کہ میں یہاں ہوں پہن چلے آئے۔
 ان سے اور **بسم اللہ** سے ہنسی ہوتی تھی۔ کالی گلہوں سے لے کے کشمکش ہاتھ نوٹ پھونچ پانی تھی۔ ہر سراج ایسا چھوڑا تھا کہ میں بڑا ماتی۔
 گوہر مرزا آتے ہی میرے اور **بسم اللہ** کے چچ میں میٹھ گیا۔ اور مجھ سے **بسم اللہ** کے گلے میں ناتھ ڈال دیا۔
 گوہر مرزا۔ آج فغوب کلا رہی ہو جی جاہتا ہے۔
 اب جو دیکھتی ہوں تو مولوی صاحب کے اٹنے کی جھڑپوں میں حرکت ہونے لگی ایک ہی مرتبہ گوہر مرزا کی بگاہ مولوی صاحب پر جا پڑی پہلے تو فوراً دست فیکھی چہا ہنا کان زور سے پڑا۔ جھپکے کیجئے ہٹا (بہ معلوم ہوتا تھا گویا آپ۔ ڈر گئے کہ **بسم اللہ** اس حرکت پہلے تھا شاہنشاہ پڑی غلطی کر گئے تھے۔ جن نے ستر پر رکھ لیا۔ مگر مولوی صاحب بہت ہی عین عین ہوئے۔ بلکہ قریب تھا کہ والدہ جان رکھ لیا۔ مگر **بسم اللہ** نے کہا "بیٹو۔ بیچارے پھر میٹھ گئے۔ **بسم اللہ** بھی کب سی شدہ رہتی ہو مرزا پریہ ظاہر کرنا نہ نظر تھا کہ گوہر مرزا میرے ساتھ تھیں۔ تاکہ مولوی صاحب دیکھ کے بتلین

گھر مرزا سے ہنسا شہر دے کیا۔ بڑی دیر تک مولوی صاحب کو اس دھوکے میں رکھا۔ اور ادھکا وہ حال جیسے کوئی انگاروں پر لوٹ رہا ہو۔ ٹہلے جاتے ہیں۔ مارے ہنسی کے سرے بیٹھ میں کل پڑے جلتے ہیں۔ آخر مولوی صاحب کی سچی پر بھی کورم آیا۔ میں نے بھاڑا پھوڑا دیا۔ اسپین بسم اللہ مجھے ناراض بھی ہو کر میں نے گوہر مرزا کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ اے بس اب جھلاؤں کر چکے چلو۔ اب مولوی صاحب کو معلوم ہو گیا کہ گوہر مرزا سے مجھے رسم ہے۔ بسم اللہ سے کوئی واسطہ نہیں۔ بہت ہی خوش ہوئے۔ باچھین کھل گئیں۔

دسوا۔ مولوی صاحب سے تو پاک محبت تھی نہ؟

امراؤ۔ پاک محبت تھی۔

دسوا۔ پھر ادھکا جلد نہ چاہیے تھا۔

امراؤ۔ واہ کیا پاک محبت بن رہا تھا نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے۔

دسوا۔ تو پاک محبت ہوگی۔

امراؤ۔ اب یہ ادھکا ایمان جاسے۔ میں تو یہی سمجھتی تھی۔

ماشن ہو۔ یوں خود خود ہی پار کرنے کے لائق تھی۔ کون ایسا ہوگا جو اس پر زہر نہیں ہو جاتا۔ اول ہی اول پار سے صاحب کو محبت تھی۔ ہزار بار دے پے کا سلوک کیا۔ دائمی جان دیتے تھے۔ خورشید لے بھی انھیں اچھی طرح کا سبب اطمینان ہو گیا کہ سچا عاشق ہے خود جان دے لگیں۔ دن دن بھر کھانا نہیں کھاتیں۔ اگر اونکو کسی دن اتفاق سے دیر ہوگئی۔ چھٹی زار و قطار رو رہی ہیں۔ ہم سب نے صلاح دی۔ دیکھو خورشید ایسا نہ کرو۔ مرد سے بے حرمت ہوتے ہیں۔ نکار سے اون کے صرف آشنائی ہے۔ آشنائی کی بنا دیکھا۔ نکاح نہیں ہوا۔ بیاہ نہیں ہوا۔ اگر ایسا چاہوگی تو اپنا برا جا ہوگی۔ چتا ہوگی۔ آخر ہمارا ہی کیا ہوا۔ پار سے صاحب نے جب دیکھا کہ زہری پار کرتی ہے۔ لگے غرنے کرنے۔ یا تو آٹھون پہر پیچھے رہتے تھے۔ یا اب ہیں کہ دودھ دن نہیں آتے۔ خورشید جان دے دیتی ہے۔ روٹی سے بیٹھتی ہے۔ کھانا نہیں کھاتی عجیب حال ہے۔ خانم کو صورت سے نفرت ہوگئی۔ یہاں تک کہ آنا جانا کھانا۔ پنا۔ آدمیوں کی تنخواہ سب موقوف۔

میں نہیں سمجھ سکتی کہ اس حسن کے ساتھ عشق اوسکے دل میں کسے بھر دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی مرد آدمی کی جو روٹی تو میان بوی میں خوب بنا ہوتا عمر بھر مرد اپاؤں دھو دھو کے پنا۔ بشرطے کہ قدر دان ہوتا۔ بسم اللہ خورشید کے ناوے کے برابر بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ اوپر وہ نمک نشو و عشر و وہ غمزہ۔ وہ بختہ کہ خدا کی پناہ۔ مولوی صاحب کا حال تو آپ سن ہی چکے ہیں۔ اور آٹھنا سے بھی اوسکا سلوک کچھ اچھا نہ تھا۔ اصل تو یہ ہے کہ اوسکو اپنی مان کی دولت بڑا کھنڈ تھا۔ دائمی دولت بھی لازوال تھی۔ اپنے آگے کسی کی ہنسی ہی نہ سمجھتی تھی۔ خورشید کی ذات سے خانم کو بڑی امیدیں تھیں۔ دائمی اگر اوس میں زہری ہوتی تو فلاں کون ہی پیدا کرتی۔ اس حسن و خوبی بڑا دوا بکھل نہ تھی۔ ناپے تین بھی بالکل چھوٹے تھیں۔ صرف صورت ہی صورت تھی۔ اول اول بھرے بہت تھے۔ آخر جب معلوم ہوا کہ کھانے ناپے میں تفریق نہیں۔ تو گون نے بلانا چھوڑ دیا۔ جو خادہ صورت کا مشن ہوا کہ آنا تھا۔ آجھے اچھے مرنے تھے مگر جب تک

خانم کی دھون میں میرے سوا یوں تو ہر ایک اچھی تھی۔ مگر خورشید کا جواب نکلا۔ ہری کی صورت تھی۔ رنگ میدا و شہاب۔ ناک۔ غنہ۔ گویا صالح قدر سے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ آنکھوں میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ موتی کو شکر کے بھر دیے ہیں۔ ہاتھ پاؤں سدا دل نور کے سلنے میں ڈھلے ہوئے۔ بھرے بھرے بازو گول سکایا۔ جامہ زری وہ تیامت کی کہ جو پہنا معلوم ہوا یہ اسی کے لیے مناسب تھا۔ اداؤں میں وہ دلفریبی وہ بھولاہن کہ جو ایک نظر دیکھے ہزار جان سے زہر نہیں ہو جائے۔ جس نخل میں جا کے جھمکے معلوم ہوا ایک شمع روشن ہوگئی۔ جیسوں زندیاں جھٹی ہون لگا۔ اوس پر پڑتی تھی۔ یہ سب کچھ تھا مگر تقدیر کی اچھی نہ تھی اور تقدیر کو بھی کیوں الزام دینیے خود اپنے ہاتھوں عمر بھر خراب رہی بیعت یہ ہے کہ وہ زہری پے کے لائق نہ تھی۔ بیواڑے کے ایک زیندار کی لڑکی تھی۔ صورت سے تفرقت ظاہر تھی جس خدا داد تھا۔ مگر اس حسن و جمال پر خط یہ تھا کہ کوئی بھیر

۸۰
 دیکھا۔ منہ ہوتا ہے ہوئے مچھی بن۔ افسوس غنم سو رہا۔ ہر ایک سے سیرخی۔ بے
 اعتنائی۔ یہ حالت دیکھ کے کوئی نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ اب پیارے صاحب
 ہی صحت رکھے۔ ادھر تماشا دیکھے کہ پیارے صاحب سے والد پر عتاب شاہی
 نازل ہوا۔ گھر کی جھبی ہو گئی۔ باغیر چین نیائی۔ بچا سے محتاج ہو گئے۔ یہ بے
 ہوا۔ مگر خورشید کے حسن بن کی نہ ہوئی۔ اب یہ ضد ہوئی کہ مجھے گھر میں بٹھا لو۔
 پیارے صاحب نے پیاس خاندان یا یوں کہو کہ بابے ڈر سے منظور نہ کیا۔ بخیر
 کی آس ٹوٹ گئی۔

خورشید بہت ہی بھلی عورت تھی۔ سیکڑوں روپے پھیلا پھیلا کے لوگ کھا گئے۔
 فقیر فقرا سے آپ کو بڑا غناؤ تھا۔ ایک دن ایک شاہناہ صاحب شریف لائے وہ
 ایک کے دوڑتے تھے۔ خورشید نے اپنے کڑے اور سنگن کی چوڑیاں اوتا دیں۔
 شاہ صاحب نے ایک کوری انڈی منگوائی۔ اوسین سیاہ تل بھر دئے۔ کڑے
 سنگن انڈی میں رکھ کے چینی ڈھانک دی۔ شالبات کا ایک پیارہ گلے میں
 باندھنا ڈرے سے باندھ دیا۔ شاہ صاحب دوڑا ہو گئے۔ چلتے چلتے کہتے کہ آج نہ
 کھوینا۔ کل صبح کو کھوینا۔ مرثیہ کے حکم سے ایک کے دو ہر جا بن گئے۔ صبح کو ناڈی
 کھوئی گئی۔ کالے نلوں کے سوا کچھ نہ ملا۔

ایک جوگی نے کالے ناگ کا بچن منہ۔ کال کے دکھایا کہ یہ تجھے رسون
 آکے دوس جاتے گا۔ بی خورشید نے کافون سے بے با بیان اوتا۔ کالے کین۔
 خورشید کہ غصہ کھی آتا ہی نہ تھا۔ ایسی نیکدل اور نیک مزاج عورتیں ہو بیٹرا دین
 کم ہوتی ہیں۔ رنڈیوں کا کیا ذکر مگر ان ایک دن غصہ آ یا جس دن پیارے صاحب
 مانگے کا جوڑا پہنکے آئے۔ ادل تو پکی مچھی رہی۔ خوڑی دیر سے بھینکا لون پر سیرخی
 نمودار ہوئی۔ رفتہ رفتہ سرخ بھوکھا ہو گئے۔ اوسکے بعد اٹھی۔ مانگے سے جوڑے
 کے پڑنے پر رے کر ڈائے۔ اب وقت شروع ہوئی۔ دو دن تک رو یا کی۔ تمام دنیا
 نے سمجھا یا۔ کچھ نہ مانا۔ آخر بخار آئے لگا۔ دو مہینے بیمار رہی لینے کے دینے لگے۔
 یکسوں نے دن تجیز کی۔ لیکن خدا کے فضل سے دو مہینے کے بعد خود بخود مزاج دو
 بر اصلاح ہو گیا۔ اب پیارے صاحب بظاہر چمک چمک ہو گئی۔ اسکے بعد اور لوگوں سے

۸۱
 ملاقات ہوئی مگر کسی سے دل نہ لگا۔ اور نہ کسی کا دل ان سے پہلے کبے تھی
 اور بے اعتنائی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ بظاہر ملتی نہیں۔ مگر دل نہ ملتا تھا۔

ساو ل کا مہینہ ہے۔ سہ پہر کا وقت ہے۔ پانی برس کے کھل گیا ہے۔ چوک کے کوٹوں
 اد بلند دیواروں پر جا بجا دھوپ ہے۔ ابر کے ٹکڑے آسمان پر ادا دھڑکتے
 جاتے نظر آتے ہیں۔ چمک کی طرف رنگ رنگ کی شفق چھٹی ہوئی ہے۔ چوک میں
 سفید روشن کا مجمع زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ آج زیادہ جمع کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ
 جمعہ کا دن ہے لوگ عین باغ کے پھل کچھ جلد جلد قدم اٹھاتے چلے جاتے ہیں۔

خورشید۔ ایس جان۔ بسم اللہ۔ من پہلے جانے کے لیے بن میں رہی ہیں۔
 دعائی دوپٹے بھی زنگر زنگ کے دے گیا ہے۔ بچے جاتے ہیں۔ بالوں میں
 سنگیان بھری ہیں۔ چوٹیاں گوندھی جاتی ہیں۔ جاری روڑ کالے جلتے ہیں۔
 خانم صاحب سائے چوکے رگنائیکے لگی بیٹھی ہیں۔ بوجھنی ابھی پھولان کھا کے
 پیچھے بیٹھی ہیں۔ خانم صاحب کے سائے سر صاحب بیٹھے ہیں۔ پہلے جانے پر اصرار کر رہے
 ہیں۔ وہ کہتی ہیں۔ آج میری طبیعت شست ہے۔ میں نہیں جانے کی۔ ہم لوگ
 دعائیں ایک رہے ہیں۔ خدا کرے نہ جائیں تو پہلے کی بہار ہے۔

خورشید پر اوس دن غضب کا جو بن ہے۔ گوری رنگت ملل کے دعائی ڈپٹے سے
 پھولی نکلتی ہے۔ اودی گزٹے کا پا جا رہے بڑے پانچوں کا بھلے نہیں سمجھتا۔
 بھنی بھنی کرتی مباحثہ ڈھارہی ہے۔ ہاتھ گھلے میں ہکا ہکا زور ہے۔ ناک میں
 سر سے کیل۔ کانون میں سونے کی اختیاں۔ ماتھ من کڑے۔ گھلے میں مونوں کا کھٹا
 سائے کمر سے من غذا دم آئند لگا ہے۔ اپنی صورت دیکھ رہے ہیں۔ کیا کہوں۔ کیا
 صورت تھی۔ اگر کسری صورت دیکھی ہوتی تو اسے عکس کی آپ ہی بلا میں لیتا
 مگر اذ کو یہ غم ہے کہ اے اس صورت پر کوئی نہ دیکھنے والا نہیں۔ پیارے صاحب سے
 لگاڑی بو چکا ہے۔ چہرہ ادا اس ادا اس ہے۔ اے وہ ادا اسی بھی غضب کر رہی
 ہے۔ آجھی صورت والوں کو سب کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت اوس پری پری
 کی صورت دیکھنے سے دل پسا جاتا ہے۔ اور نو کوئی شال اپنے دل کی حالت سمجھ میں

نہیں آتی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی آچھے شاعر کا کوئی شعر دروازہ میں سننا ہے اور دل اوسکے
 مزے لے رہا ہے۔
 بسم اللہ کی صورت کچھ بڑی نہ تھی۔ کھلتا ہوا سا نولادنگ۔ کتا بی چہرہ۔ سوتوان ناک
 بڑی بڑی آنکھیں۔ سیاہ پتلی۔ چہرہ رابہ۔ بوناسا قد۔ کار چوبی نولوان جڑا۔ کھا ہی
 کر سب کا ڈو پیٹ۔ بنت مچی ہوئی۔ زرد گرنٹ کا پاجامہ۔ پیش قیمت زور۔ سر سے
 پاؤں تک گھنے میں لدی ہوئی۔ اوسپر طرہ بھولون کا گہنا۔ آئین میں جو خسی کی دوہڑ
 معلوم ہوتی تھی۔ پھر اوسپر بات بات میں خوشی و شہارت۔ سیلے زن بھونچکر کسی کا تہ
 چڑھا دیا۔ کسی سے آنکھ ڈرائی۔ جب وہ دیکھنے لگا تو نہ پھیر لیا۔ مان یہ کہنا بھول گئی
 کہ ہم لوگ بناؤ سنگار کر کے میاؤں پر سوار ہوئے۔ سیلے بھونچے۔
 سیلے میں وہ بھیرن تھیں کہ اگر قتالی بھینکو تو سہی سر جاے۔ جا بجا کھلونے داے
 مٹائی والوں کی دوکان میں۔ خواہنے داے۔ بیوہ فروشن۔ مار داے۔ بنولی سائین
 غرض کہ جو کچھ سیلون میں ہوتا ہے سب کچھ تھا۔ مجھے اور تو کسی چیز سے کچھ کام نہیں۔ لوگوں
 کے چہرے دیکھنے کا ہمیشہ سے شوق ہے۔ خصوصاً سیلے مانخون میں۔ خوش۔ ناخوش۔
 مغلس۔ تو نگر۔ بے وقوف۔ عقل مند۔ عالم۔ جاہل۔ شریف۔ رذیل۔ سخی۔ بخیل۔
 یہ سب حال چہرے سے کھلتا ہے۔ ایک صاحب ہیں کہ وہ اپنے تنزیل کے انگر کے
 اور اودی صدری۔ نگہ دار ٹوپی۔ چشت کھٹنے۔ اور مٹلی چڑھوں جوتے پازاے کو
 ملتے ہیں۔ کوئی صاحب ہیں حسدنی دنگا ہوا دوپٹے سر سے آڑا باندھے ہوئے زبڑوں
 کو گھورتے پھرتے ہیں۔ ایک صاحب آئے توہن بیلادیکھنے۔ مگر بہت ہی کمزور ہیں
 بھین۔ کچھ چٹکے بڑبڑاتے بھی جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیوی سے رکھے آئے ہیں۔
 جن باؤں کے جواب بروقت سوچتے تھے۔ اونہیں اب یاد کر رہے ہیں۔ کوئی صفا
 اپنے چھوٹے سے لڑکے کی اذگلی پکڑے اس سے یا تین کرتے چلے آتے ہیں۔
 ہر بات میں امان کا نام آتا ہے۔ "امان کھانا بچانی ہوگی"۔ "امان کا جی مانڈ
 ہے"۔ "امان سو رہی ہوگی"۔ "امان جاگتی ہوگی"۔ بہت خوشی دیکر کہ وہ نہیں تو امان
 یکدم کے امان چلی جائیں گی"۔ ایک صاحب سات آٹھ برس کی لڑکی کو سر نہ بچر
 بٹھا کے لائے ہیں۔ کندھے پر چڑھا تے ہوئے ہیں۔ ناک میں ٹھنسی سی ٹھنسی ہے۔ اونہی

چرنی گندھی ہوئی۔ لال شالبات کا موبات پڑا ہے۔ مانخون میں چاندی کی چوڑیا
 ہیں۔ معصوم کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑے ہوئے ہے۔ کلایان ٹوکھی جاتی ہیں
 کوئی چوڑیا نہ اوتارے۔ کہیے پھر بچا کے لانا ہی کیا ضرور تھا۔
 نیچے دوسرے صاحب ایک اون کے یار غار بھی ساتھ ہیں۔ فرانشی بھالیان
 چل رہی ہیں۔ آمان پان تو کھاؤ۔ کھٹ سے چہرہ تھولی کی دوکان پر بھینکا معلوم
 ہو کہ آپ بڑے تو نگر ہیں۔ چہرہ دوپہیہ کی آپ کے آگے کیا اہل ہے۔ فوراً ہی
 حقے واسے کو بھی آواز دی۔ "بیٹی سانی او حمرانا۔ حقہ ملگا ہوا ہے"۔ ایک اور
 یار ان کے آواز ہوئے۔ معمولی گائی گلوج کے بعد جو وقت ملاقات سلام بندگی۔
 مزاج پر سی تبے کھلف دوستوں میں ہو کر کرتی ہے۔ "آپے پان تو کھلاؤ"۔ لطف یہ کہ
 آپ سلمان یار ہندو۔ جب تھولی نے پان دیے چھپ سے پڑھ کے لے لیے۔
 آپے یار بھول گئے۔ اب یہ کھیا نے ہوئے۔ پینٹ سے ایک چہرہ نکالا۔ لوبھی نہیں
 بھی دو پان دینا۔ الاچی بھی چھوڑ دینا۔ چونا نہ دیا وہ ہو۔ دوست سے اچھا تو علم
 تو پلو اؤ گئے۔ یہ چلم حقے سے اوتارے ہی حقے کے ساتی نے گھور کے دیکھا۔ فوراً ہاتھ
 سے حقہ ادھرب سے چہرہ نکال کے دیدیا پڑا۔
 گھر پر رانے ٹوٹی جھیل کے کنارے فزق بچھو دیا تھا۔ وہیں جا کے ٹھہرے۔ اور
 اور دوسرے خون میں پھرتے رہے۔ سر نام سے دو گھڑی رات گئے تک میٹے کی سیر
 کی۔ پھر گھر چلنے کی ٹھہری۔ اپنے اپنے میاؤں میں آکر سوار ہوئے۔ اب جو دیکھتے
 ہیں تو خور رشید جان کا میا نہ قالی سے اونکا کہیں پتہ نہیں۔ پہلے تو بہت شہرہ ہوا کہ
 -ہیں کہیں درخون میں ہو گئی۔ دودر دودر تک تلاش کے لیے آدمی دوڑے۔ گور پڑا
 نے جا کے سارا میلا چھان مارا۔ کہیں پتا نہ ملا۔ آخر یاروس نوکے گھر واپس آئے
 خاتم نے سنتے ہی سر پیٹ لیا۔ تمام گھر کو صدمہ ہوا۔ میں خود رات بھر رویا کی
 پیار سے صاحب کے مکان پر آدھی گیا۔ وہ بیچارے اسی دفت دوڑے ہوئے تھے
 ہزاروں تسمین کھا جن کہ "مجھے بالکل معلوم نہیں۔ میں سیلے بھی نہیں گیا۔ بیگ کی
 طبیعت جلیل ہے جاتا تو کو تو نگر جاتا"۔ پیار سے صاحب بیرون بجا سا گان تھا۔ انکے
 تسمین کھانے کے بعد کسی کو شبہ بھی نہ رہا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ شادی کے بعد بیوی کے

ایسے باندہ ہو گئے تھے کہ جو کما کر آنا جانا اور غنوں نے بالکل ہر توف کر دیا تھا۔ رات کو
گھر سے نکلتے ہی نہ تھے۔ نور شید کے گم ہونے کی خبر سننے کے کچھ تو اگلی محبت کے خیال سے
اوپر کچھ غلام کی مرآت سے۔ نہیں معلوم کس طرح چلے آئے تھے۔

نور شید کے گم ہونے کے ڈیرہ پہنچنے کے بعد ایک صاحب جنگی وضع شہر کے بانکوں کی
ایسی تھی۔ ساؤ لارنگ۔ چھرا بدن۔ ایک دو سالہ سرے پیٹے۔ اور ایک سرے
باندھے میرے کمرے میں ڈانڈ چلے آئے۔ اور آئے کے ساتھ ہی سائے تالین کے
کنارے بیٹھ گئے۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ طبیعت میں کسی قدر کمینہ بن ہے۔ یا ابھی نیلے
ہیں۔ زندہ لون کے مان کم چلے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور وقت میں اکیلی میٹھی تھی۔
میں نے بوا حسینی کو آواز دی۔ وہ کمرے میں آئیں۔ اور ان کے آتے ہی وہ صاحب
اور بیٹھ کھڑے ہوئے۔ اور کسی قدر بے کلفی کے ساتھ بوا حسینی کا ہاتھ مکر لیا۔ علی
بھا کے کچھ بائیں کمین۔ جنہیں کچھ میں نے سنیں۔ کچھ نہیں سنیں۔ اسکے بعد بوا حسینی
غلام صاحب کے پاس گئیں۔ وہاں سے آکے پھر بائیں ہوئیں۔ آخر کلام یہ تھا۔ تو کچھ
ایک پہنچنے کی خواہہ جنگی دینا ہوگی۔ اور ان صاحب نے کمرے میں زور ہون کی کالی۔
بوا حسینی نے گودھیلائی۔ اور غنوں نے جھن سے روپے چھینک دیئے۔

بوا حسینی۔ یہ کہتے ہیں۔

وہ صاحب۔ نہیں معلوم۔ گن بیچئے۔

بوا حسینی۔ آئے ہے۔ مجھے تو گھر کا گنا بھی نہیں آتا۔

وہ صاحب۔ میں جانتا ہوں پچھرو روپے ہرنگے۔ شاید ایک دو کم ہوں۔ یا نا
بوا حسینی۔ میان پچھرو کہتے ہیں۔

وہ صاحب۔ میں یہی اور پندرہ پچیس کم سو۔

بوا حسینی۔ پچیس کم سو۔ تو یہ کہتے دن کی خواہ ہوئی۔

وہ۔ پندرہ دن کی۔ کل وہ بھی پندرہ دن کی دے دو گا۔ پورے ڈیرہ سو خرچے

آپ کو جو خرچ جائیں گے۔

یہ نا خرچ ہے۔ کی سن کے مجھے بہت ہی برا معلوم ہوا۔ اب تو بالکل ہی نہیں ہو گیا کہ

کوئی ایسے ہی ویسے ہیں۔ مگر مجبور۔ زبڑی کا پیشہ۔ دوسرے پرانے میں
کرتی تو کیا کرتی۔

بوا حسینی روپے کے نانم کے پاس گئیں۔ غلام اور وقت نہیں معلوم کہ نیکی کے
دم میں تھیں کہ فوراً منظور کر لیا۔ بلکہ مجھے تعجب ہوا۔ اس لیے کہ بڑے بڑے ریسوں سے
روپے کے بارے میں ایک دم کے لیے مرآت نہیں کرتی تھیں۔ یا اس وقت ایک دن کا
دندہ مان لیا۔

اس معاملے کے طے ہونے کے بعد وہ صاحب میرے ہی کمرے میں شب باش ہوئے۔
کوئی پھر ضرورت باقی ہوگی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے کمرے کے چنے آکے
دستک دی۔ وہ صاحب فوراً اوٹھ بیٹھے اور کہا لو اب میں جاتا ہوں۔ کل شب کو
پھر اون گنا۔ چلتے وقت پانچ اشرفیاں اور تین انگوٹھیاں۔ ایک سوئے کی یا تو
کا گھینہ۔ ایک فیروزہ کی ایک میرے کی۔ چکودین۔ اور کہا۔ یہ تم اپنے پاس رکھنا۔
غلام کو نہ دینا۔ میں نے خوشی خوشی ہاتھ میں پسین۔ اور اپنی اذ کلکون کو دیکھنے
لگی۔ مجھے بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتی تھیں۔ پھر صند و چھ کھولا۔ اشرفیاں اور
انگوٹھیاں جو غلام نے میں چھپا کے رکھ دیں۔

دوسرے دن شب کو پھر وہی صاحب آئے۔ اور وقت میں فیلم لے رہی تھی
وہ بھی ایک کنارے آکر بیٹھ گئے۔ گانا ہوا کیا۔ پانچ روپے سازندون کو دیے۔
اوستا دجی اور سا رنگے خوشامد کی باتیں کرنے لگے۔ اوستا دجی نے کمرے میں جو دو شاہ
بندھا تھا اس کے اینٹھنے کی فکر کی۔ پہلے قرین کی پھر منہ پھوٹ کے ہٹکا۔ کمرہ خالی
گیا۔ انھوں نے نہ دیا۔

وہ صاحب۔ اوستا دجی۔ روپہ۔ پیسہ۔ اور جس چیز کو کہئے موجود ہے۔ یہ دو شاہ
میں نہیں دیکھتا۔ ایک دوست کی نشانی ہے۔

اوستا دجی اپنا سا منہ کے چپ ہو رہے۔

اسکے بعد فیلم نوٹ ہوتی۔ بوا حسینی کو باقی پچھرو گن دیے گئے۔ پانچ روپے
بوا حسینی کو اپنی طرف سے دیے۔ وہ ٹھٹھت ہوئیں۔ جب وہ اور میں صرف دو
آدی کمرے میں رہ گئے۔ میں نے پوچھا آپ نے جو کہاں دیکھا تھا جو یہ غیبت کی۔

۵۵۔ دو مہینے ہوئے جمہ کو عیش باغ کے پیلے میں۔

۵۶۔ اور پھر آئے دو مہینے کے بعد۔

۵۷۔ میں باہر چلا گیا تھا۔ اور اب پھر جانے والا ہوں۔

اب میں نے زندگی بننے کی گلا دھڑکائی

۵۸۔ تو ہمیں چھوڑ کے چلے جاوے گا۔

۵۹۔ نہیں۔ پھر بہت جلد چلا آؤں گا

۶۰۔ اور تمہارا مکان کہاں ہے

۶۱۔ مکان تو فرخ آباد میں ہے۔ مگر یہاں بہت کام رہتا ہے۔ بلکہ رہتا ہوں

۶۲۔ کچھ دنوں کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔ پھر چلا آتا ہوں۔

۶۳۔ اور یہ دو سالہ کسی نشانی ہے!

۶۴۔ کسی کی نہیں

۶۵۔ واہ میں سمجھ گئی یہ تمہارے آشنا کی نشانی ہے۔

۶۶۔ نہیں تمہارے سر کی قسم میرے کوئی آشنا و آشنا نہیں ہے۔ بس تمہیں ہو جو کچھ

۶۷۔ میں۔ تو پھر مجھے دیدو۔

۶۸۔ میں نہیں دے سکتا۔

۶۹۔ یہ بات مجھے بہت ناگوار ہوئی۔ اتنے میں انہوں نے بڑے بڑے مونیوں کا مالدار

۷۰۔ زبرد کی ہڑین لگی ہوئی تھیں۔ اور ایک جوڑی پہرے کے کڑے کی اور دو انگوٹھیں

۷۱۔ سونے کی میرے آٹے رکھنے سے سب تو میں نے خوشی خوشی اوٹھالیا صد وچھ

۷۲۔ کھول کے بند کرنے لگی۔ مگر مجھے غیب ہوا کہ یہ ہزاروں کی رقم تو بون بھگو دے دینے میں

۷۳۔ مگر یہ دو سالہ زیادہ ہے زیادہ پانچو کا ہو گا۔ اس سے کون انکار کیا۔ واقعی مجھ کو

۷۴۔ وہ دو سالہ پسند نہ تھا۔ جو میں زیادہ امراد کرتی۔ اسے کام سے کام تھا۔

۷۵۔ ان صاحب کا نام فیض علی تھا۔ پہر ڈیڑھ پہر رات گئے جاتے تھے۔ اور کبھی آدھی

۷۶۔ رات کو کبھی پچھنے پہرے اوٹھ کے چلے جاتے تھے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں کئی مرتبہ

۷۷۔ دستک یا سیٹی کی آواز میں نے سنی اور فوراً ہی فیض علی اوٹھ کر روانہ ہو گئے۔

۷۸۔ فیض علی سے رقم پرے کوئی ڈیڑھ مہینہ گذرا ہو گا کہ میرا صد وچھ سادے اور چڑا

۷۹۔ مجھے سے جبرگیا افریقان اور دو بون کا شمار نہیں۔ اب میرے پاس خاتم اور بونجی

۸۰۔ سے چھاپا ہوا دس بارہ ہزار کا مال ہو گیا تھا۔

۸۱۔ فیض علی نے مجھ کو اگر محبت نہ تھی تو نفرت بھی نہ تھی۔ اور نفرت ہونے کی کیا وجہ۔

۸۲۔ اول تو وہ کچھ بد صورت بھی نہ تھے۔ دوسرے۔ لینا۔ دینا عجب چیز ہے۔ میں سچ کہتی

۸۳۔ ہوں۔ بیشک وہ نہ اتنے تھے میری آنکھیں دروازے کی طرف لگی رہتی تھیں۔ مگر بڑا

۸۴۔ کی آہ رفت ان دنوں صرف دن کی رہ گئی تھی۔ شب کے آنے والوں میں سے بھی

۸۵۔ اکثر لوگ بچھ گئے تھے کہ میں کسی کی پابند ہو گئی ہوں۔ اس لیے سویرے سے کمک جاتے

۸۶۔ تھے۔ اور جو صاحب جم کے بیٹھے تھے اوکو میں کسی نہ کسی پیلے سے ملان دیتی تھی۔

۸۷۔ خورشید کی تلاش بہت کچھ ہوئی۔ مگر کہیں سہارا نہ ملا اس آستان میں فیض علی

۸۸۔ کی رتبہ دو دروین میں دن تک غائب رہا اور پھر چلے آئے۔ وہی فیض علی کو

۸۹۔ مجھے بہت محبت تھی جس کا اظہار طرح طرح سے ہوتا۔ اگر یہ اول ابتدائے گھر مرزا کی

۹۰۔ طرف مائل نہ ہو گیا ہوتا۔ تو میں ضرور فیض علی سے محبت کرتی اور اسی کو دل دیتی

۹۱۔ اس پر میں نے انکی دلجوئی اور خاطر داری میں کسی طرح کی نہیں کی۔ میں نے فیض علی

۹۲۔ کو غریب دے رکھا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ اور وہ بچارہ میرے دم میں بھینسا

۹۳۔ ہوا تھا جو کچھ غصہ اوسے بھگو دیا۔ اسکی کسی ایکساؤن کا نہ خبر نہ تھی۔ خاتم اور بونجی

۹۴۔ کے کہنے سے مجھے فرمائشیں بھی کرنا پڑتی تھیں۔ اونکی بجا آوری کو بھی وہ اپنا فرض سمجھتا

۹۵۔ تھا۔ اوسکو روپے پیسے کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ ایسا دل چالاک آدمی نہ میں نے دیکھا

۹۶۔ میں دیکھا۔ نہ شہزادوں میں۔

۹۷۔ رسوا۔ جی مان کون نہیں۔ مال مفت۔ دل بے رحم۔ بھلا اوسکے برابر کسا دل

۹۸۔ ہو سکتا تھا۔

۹۹۔ امراد۔ مال مفت کیون؟

۱۰۰۔ رسوا۔ نہیں تو اپنی آمان جان کا زبور و زناپ کو اذمارا اذمار کے لادیا کرتا

۱۰۱۔ تھا۔

۱۰۲۔ امرادو ہمیں کیا معلوم تھا۔

شب کے آنے والوں میں ایک پٹال جوہری تھے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کے چلے جاتے تھے۔ ان کو چار آدمیوں میں بیٹھنے کا فرما تھا۔ اگر انکی خاطر داری ہوتی ہے تو اور کسی کے آگے جانے سے ان میں کچھ غرض نہ تھی۔ مہینے میں دو سو روپے نقد کا سوا اور فرمائشوں کا ذکر نہیں۔ فیض علی کی ملاقات کے دامنے میں موٹگی آمد و رفت بھی کم ہو گئی تھی۔ یا تو ہر روز آیا کرتے تھے۔ یا دوسرے دوسرے دن آنے لگے۔ پھر ایک مرتبہ پندرہ دن کا غوطہ لگا یا۔ اب جو آئے۔ تو کچھ ادا داس ادا داس معمولی باتوں کا جواب دیتے ہیں اور پھر خاموش ہو جاتے ہیں۔ میں نے سب پوچھا۔

پٹال کیا نئے نہ سنا ہو گا؟ میں کیا؟
پٹال۔ ہم تو تباہ ہو گئے۔ گھر میں جوہری ہو گئی۔ پشیمون کا انا نہ سب لکھا گیا۔
میں۔ (چونک کے) ماہین جوہری ہو گئی۔ کتنے کا مال گیا؟
پٹال۔ سب ادا لکھا گیا۔ راکیا۔ دو لاکھ کا جو اہر ادا لکھا گیا۔
میں۔ دل میں تو ہنسی۔ ہنسی اس بات پر کہ ان کے باب جتنا مل کر ڈرنی مشہور تھے اس میں کچھ شک نہیں۔ دو لاکھ بہت بڑی رقم ہے۔ مگر ان کے نزدیک کیا اصل ہے۔ بظاہر منہ بنا کے بہت افسوس کیا۔

پٹال۔ جی مان۔ آج کل شہر میں چوریاں بہت ہوتی ہیں۔ نواب ملکہ عالم کے مان چوری ہوئی۔ لالہ ہر پشاد کے مان چوری ہوئی۔ اندھیر ہے۔ سنا ہے باہر سے چور کئے ہوئے ہیں۔ مرزا علی رضا ایک بچہ سے جبران ہیں۔ شہر کے چور سب طلب ہو گئے تھے۔ کسی سے کچھ پتا نہیں ملا۔ وہ لوگ کا فون پر مانتے رکھتے ہیں کہ یہ ہمارا کام نہیں۔

پٹال کے آنے کے دوسرے دن میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوں کہ چوک میں ایک خورہوا۔ میں بھی تھلن کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اب جو دیکھتی ہوں تو ظلال کا انہوہ ہے۔

ایک۔ آخر کار ہرے نا۔ دوسرا۔ واہرنا کیا کہنا۔ کو توال ہو تو ایسا۔

تیسرا۔ کیوں بھی کچھ مال کا پتا بھی لگا۔
چوتھا۔ بہت کچھ برآمد ہوا۔ مگر بھی بہت سا باقی ہے۔
پانچواں۔ میان فیض بھی گرفتار ہوئے۔
چھٹا۔ وہ کیا آتے ہیں۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میان فیض منہ سے چلے آتے ہیں۔ سپاہیوں کا گارہہ ساتھ ہے۔ گرد غلائن کا انہوہ ہے۔ میان فیض منہ پر دو پٹے ڈالے ہوئے ہیں اونکی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ یہ دوپہر سے پہلے کا واقعہ تھا۔

حسب معمول فیض علی کوئی پیر بھرات گئے انشرف لائے۔ کمرے میں میں ہوں اور وہ ہیں۔ آتے ہی کہا۔ آج ہم باہر جاتے ہیں۔ برسوں آئیں گے۔ دیکھو ادا داس جو کچھ ہنسنے تھیں دیا ہے اسکو کسی بڑا ہرنہ کرنا۔ نہ بوا جینی کو دینا۔ نہ خام کو دکھانا۔ خمارے کام آئے گا۔ ہم برسوں ضرور آئیں گے۔ اچھا یہ تو کہو کہ ہمارے ساتھ ٹھوٹے دنوں کے لیے باہر چل سکتی ہو۔

میں۔ تم جاننے ہو کہ میں اپنے بس میں نہیں۔ خام صاحب کو اختیار ہے۔ تم ادوں سے کہو۔ اگر وہ رضی ہوں تو مجھے کیا غدر ہے۔

فیض علی سچ ہے۔ تم لوگ بڑے بے دفا ہوتے ہو۔ ہم تو غیر جان دستے ہیں اور تم ایسا خشک جواب دینی ہو۔ اچھا۔ بوا جینی کو بلواؤ۔
میں نے بوا جینی کو آواز دی۔ وہ آئیں۔

فیض علی۔ (میری طرف اشارہ کر کے) بھلا کچھ دنوں کے لیے باہر بھی جا سکتی ہیں جینی۔ کہاں؟

فیض علی۔ خرخ آباد۔ میں کوئی ایسا دیا آوی نہیں ہوں۔ سبزی دکان بہت ہے۔ بالفصل میں دو مہینے کے لیے دکان جانا ہوں۔ اگر خام صاحب منظور کریں تو دو مہینے کی تنخواہ پیشگی ملے اور اسکے علاوہ جو کچھ کہیں میں دینے کو موجود ہوں۔ بوا جینی۔ مجھے تو نہیں یقین کہ خام منظور کریں گی۔

فیض علی۔ اچھا تم دو چھوڑو۔
بوا جینی خام صاحب کے پاس گئیں۔

جیلے سے تنگ کجا بنگی تو خواہ مخواہ مجھ سے پر راضی ہو جائیگی۔ میرے صند و بچے میں
ادس وقت کچھ نہ ہون گے۔ تو ہزار ڈیڑھ ہزار کی نو آئند دیاں نہیں۔ زیور کا ذکر نہیں
مگر ادس وقت بوا حسینی کے سامنے صند و بچہ کھٹو کھٹا مناسب نہ تھا۔

میں۔ جاؤ گئے بھرمین لے جانا۔

بوا حسینی۔ گھنڈ بھرمین کیا موکل دیکھا میں گے۔

میں۔ ان دیکھا بیٹے۔ جاؤ بیٹے۔ مجھے اس وقت دن ذکر۔ میری طبیعت اچھی نہیں۔

بوا حسینی۔ آخر کچھ کہہ تو لڑکی کیا ہوا۔

میں۔ مجھے بخار کی سی حرارت ہے اور سر میں شدت سے درد ہوتا ہے۔

بوا حسینی۔ (اٹھتے پرانے رکھ کے دیکھا) ان سچ تو ہے۔ پنڈا اچھیکا ہے۔ مگر مجھ سے کو تو

کہیں پرسون جانا ہو گا۔ جب تک خدانہ کرے کیا طبیعت کا یہی حال رہے گا۔ رو پیے

کیون بھیرے جائیں۔

میں اس بات کا کچھ جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ بوا حسینی جلدی سے اٹھکے چلے

بوا حسینی کی اس مہا بھی سے مجھے بہت ہی غمگین معلوم ہوا۔ اسی وقت دل میں

بدی آگئی۔ دل نے کہا اوجہ! جب ان لوگوں کو ہمارے دکھ بیماری کا خیال

نہیں۔ اپنے مطلب سے مطلب ہے قرآن کے ساتھ رہنا بیکار ہے۔

رسوا۔ کبھی پہلے بھی یہ خیال آپ کے دل میں آیا تھا۔

امراؤ۔ کبھی نہیں۔ مگر آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں؟

رسوا۔ اس لیے کہ فیض علی نے جو وہہارا دیا تھا۔ اسی سے آپ کے دل میں یہ

خیال پیدا ہوا۔

امراؤ۔ یہ تو کھلی کھلی بات ہے۔

رسوا۔ کھلی کھلی بات تو ہے۔ مگر اس میں ایک بار کبھی بھی ہے؟

امراؤ۔ وہ بار کبھی کیا ہے؟ خدا کے لیے جلدی کیجئے۔

رسوا فیض علی کے ساتھ نکل چلا۔ وعدہ کرنے سے پہلے آپ کے دل میں ٹھن گیا تھا۔

اب دل بہانے ڈھونڈ رہا تھا کہ کیونکر نکل چلون۔

امراؤ۔ نہیں یہ بات نہ تھی۔ میں دودلی ہو رہی تھی کہ جاؤں یا نہ جاؤں گو ہرگز نا

بے وقت چھڑے اور بوا حسینی کی زبردستی سے میں نے جانے کا قصد کر لیا تھا۔ بلکہ
ادس وقت تک کچھ ہون ہی سا ارادہ تھا۔ جب تک رات کو فیض علی آئے تھے۔
اونکی صورت اور مسندی دیکھ کے بچا ارادہ ہو گیا۔

رسوا۔ جی نہیں۔ پہلے ہی سے قصد مصمم ہو چکا تھا۔ اسی لیے گو ہرگز نا کچھ ہرگز نا اور
بوا حسینی کی ضد آپ کو بڑی معلوم ہوئی۔ درگاہ معمولی باتیں نہیں۔ ایسا تو کھشہ
ہوا کر نا ہو گا۔

امراؤ۔ میں نے نامہ ایسا ہی ہو گا۔ اچھا۔ پھر وہ منع کرنے والا کون تھا۔ میں سچ کہتی

ہوں کہ چلنے چلنے مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے کوئی کان میں کہہ رہا ہے۔ امراؤ نہ جا۔

کہا۔ مان۔ جس وقت دو تین لڑے اور چلی ہوں ادس وقت تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے

کوئی نامہ پکڑے کہیں تھا ہے کہ نہ جا۔ مگر میں نے نہ مانا۔

رسوا۔ یہ روکنے والا بڑا زبردست تھا۔ اسی کا حکم ماننے کی تو آپ نے

نہ مانا تھی۔

امراؤ۔ اچھا میں سمجھی۔ یہ وہ چیز ہے جو نیک کاموں کی ہدایت کرتی ہے اور

بڑے کاموں سے روکتی ہے۔

رسوا۔ جی نہیں یہ وہ نہیں تھی۔ خانم کے مکان پر رہنا کون سا ایسا اچھا کام

تھا۔ مجھے آپ کی باتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ پر کاری کو ہمیشہ بڑا سمجھتی رہی

ہیں۔ اگرچہ آپ کی حالت نے آپ کو اس کے کرنے پر مجبور کر نی رہی ہو۔ پھر خانم کے

مکان پر رہنے سے ایک شخص کا ساتھ دے کے اس کا پابند ہو جانا بد رہا بہتر تھا۔

بات یہ تھی کہ فیض علی کے حسن سلوک نے آپ کو اس کے ساتھ نکل جانے کی ترغیب

دی تھی۔ قیادہ شناسی کے ثن اور اوس میں کسی قدر ملکہ ہو جانے سے آپ پہ بھی ناجا

مردم خناس ہو گئی تھیں۔ فیض علی کے پہلے میں لوگوں کے چہرے دیکھنے کا حال

میں نے بڑے ثن سے سنا تھا۔ فیض علی کے کرتوت آپ پر ظاہر تھے۔ مگر ادس

شکل و شمائل۔ زخار و گفتار سے آپ کے دل کو آگاہی ہو گئی تھی کہ اس کے ساتھ جانے

میں کچھ نہ کچھ خطرہ ضرور ہے۔ مگر ادس کی قرب کی باتوں اور روپیے کی لالچ نے آپ

آکھن پر پردے ڈال دے تھے۔ انہوں اگر آپ علم مردم شناسی کے اصول کے ساتھ

دانش ہونے کو کبھی اسکے دم میں نہ آئیں۔
اگر وہ میں پڑھوں گی۔ کسی کتاب کا نام لیجئے۔

خانم کا مکان چوک میں بہت ہی محفوظ جگہ ہے۔ پچھم کی طرف بازار ہے۔ اور درگاہ
اور پچی اور پچی رہنویوں کے کمرے ہیں۔ ایک طرف بیابان کا مکان ہے۔ دوسری طرف
چھین باندی رہتی تھیں۔ پچھوڑے برتھ میں علی صاحب کا دیو اٹھا ہے۔ غرض کہ
کسی باب سے جو کالگاؤ نہیں ہے۔ اپنی بیوی میں پاسی نوکر تھے جو رات بھر کوٹھن پر
بھرتے رہتے تھے۔ جب سے فیض علی کی آمد رفت شروع ہوئی۔ لکھا پاسی خاص سے
کمرے کے دروازے پر دھنا تھا۔ کیونکہ فیض علی رات گئے آیا کرتے تھے۔ اور پہرہ اس کے
چلے جاتے تھے۔ دروازے بند کرنے اور قفل لگانے کے لیے لکھا مقرر کیا گیا تھا۔

شب کو حسب وعدہ فیض علی آئے۔ غوڑی اور تک چپکے چپکے چلے گئے۔ کمرے
پر اکیسے اپنے میں لکھا نے انگریزی کی۔ معلوم ہوا کہ جاگ رہا ہے۔ فیض علی نے اسے
کمرے میں بلایا۔ ایک روپر جب سے نکال کے دیا کہا جاؤ۔ کوئی کی دوکان سے اس کی اجازت
لے آؤ۔ اور اسے لو۔ یہ روپیہ افغان لو۔ نکو بنے کچھ نہیں دیا تھا۔ دروازہ جھڑ دیا۔ ہم جاگ
رہے ہیں۔ کوئی ڈر نہیں۔ لکھا سلام کر کے کمرے کے باہر نکلا۔ فیض علی نے کہا۔ لو اب چلو۔
میں ادھی۔ دوڑے کپڑے دن ہی سے گھڑی میں باندھ رکھے تھے۔ زیور کا منہ دھپہ
میں نے پہلے ہی کھسکا دیا تھا۔ گھڑی نل میں دہائی۔ ابکری دروازے کی طرف کاہستہ
یا۔ محاسن میں بل گاڑی پہلے سے گھڑی کی گئی تھی ہم دونوں سوار ہوئے اور
چل نکلے۔ ہنڈولنے کے ناکے سے غوڑی اور جا کے فیض علی کا سانس گھوڑا بے سو
لا۔ وہ بھی پہل کے ساتھ ہوا۔ صبح ہوتے ہوئے وہیں لال گنج جھونچے۔ یہاں سے ان
دو پر تک پیام ہوا۔ بھٹیاری سے کھانا بکرا کے کھایا۔

دال اور ہر کی بے شک چھلکی

مطلقاً جسمیں بوندھی گھسی گئی

نہیں وہ اسے بریلی میں داخل ہوئے۔ یہاں سے فرنگی مناسب کپڑا خریدا۔ برے
دو جوتے بنوائے۔ لکھو سے جو کپڑے ہیں کے آئی تھی اور انھیں انار کے گھڑی میں باندھا

راے بریلی سے بل گاڑی کو جو لکھو سے آئی تھی۔ رخصت کیا۔ دوسری گاڑی کو راہ
کی۔ لال گنج کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ قصبہ راے بریلی سے کوئی نوے کوس کے چلے
پر ہے۔ شاہنشاہ چلوں گئے۔ رات بھر راے میں اترے۔ فیض علی غوری سو
سلف کے لیے بازار گئے۔ جس کو گھڑی میں ہم تھے اس کے پاس دانی کو گھڑی میں ایک
دیہاتی زڈی اور زری ہوی تھی نصیبین نام تھا۔ کہنے پاتے سے درست تھی۔ کہڑے
بھی اچھے تھے۔ تھی تو دیہاتی۔ مگر زبان بہت صاف تھی۔ لب و لہجہ قصبائیوں کا ادا
تھا۔ میرے اس کے دیر تک باتیں ہوا کہیں۔

نصیبین۔ آپ کہاں سے آئی ہیں۔ میں۔ فیض آباد سے۔

نصیبین۔ فیض آباد میں تو میری بہن بیارن رہتی ہے اسے آپ غور و جانتی ہوگی
میں۔ (آخر بیارن لکھی کہ میں بھی زڈی ہوں) میں کیا جاؤں۔

نصیبین۔ فیض آباد میں کون ایسی بہن ہے جو ہلکے نہیں جانتی۔

میں۔ بہت دفن سے ان کے گھر چلے گئی ہوں۔ یہ لکھو میں رہتے ہیں۔ اس لیے میں
بھی امشرو میں رہتی ہوں۔

نصیبین۔ آخر یہاں کب تو تمہاری فیض آباد کی ہے نہ؟

میں۔ (یہ فوہا کھل کھکتی ہے۔ اب کیا جواب دوں) مان پیدا تو رہیں ہوئی۔ مگر
پہنچنے سے باہر رہی۔

نصیبین۔ تو فیض آباد میں کب کو نہیں جانتیں۔

میں۔ کسی کو نہیں۔ نصیبین۔ یہاں کب نہ لکھا تھا۔

میں۔ ان سے، ساتھ ہوں۔ نصیبین۔ اور جب وہی کہاں۔

میں۔ اوناؤ۔ نصیبین۔ لکھو ہونی ہوئی آئی ہر

میں۔ مان۔

نصیبین۔ پھر سیدھا رستہ چھوڑ کے ادھر پڑھیں کہاں آئی ہو۔ نہ بہت گنہگار
اوناؤ چلی گئی ہو میں۔

میں۔ راے بریلی میں ایک کچھ کام تھا۔

نصیبین۔ میں نے اس لیے کہا کہ ادھر کا رستہ بہت خراب ہے۔ ٹو کو دن کے رات۔

سافر دن کی آمدورفت بند ہے۔ پلیہ کے بیڑ میں سیکرڈن کو لوٹ لیا۔ ادنا دکان
رستہ اور دھڑی سے ہو کے ہے۔ تم تین آدمی ہو۔ جسمیں دو مرد ایک عورت ذات۔
تمہارے ہاتھ گلے میں گھنا بھی ہے۔ جھلا تمہاری کیا حیثیت ہے۔ وہاں تو رہا
ٹٹ جاتی ہیں۔

میں۔ تن بہ تقدیر۔
میں۔ پھسے کیا کروں۔

اسکے بعد اور ادھر ادھر کی باتیں ہوا کہیں۔ جگا دو ہرانا کوئی ضروری نہیں ہے
اور نہ مجھے یاد ہیں۔ مان بن سنے پوچھا۔

میں۔ تم کہاں جاؤ گی۔
نصیب۔ ہم تو گدا کی گونگے ہیں۔

میں۔ میں نہ سمجھی۔
نصیب۔ اے گدا کی نہیں جانتی کیسی پتیرا ہو۔

میں۔ بہن میں کیا جاتوں۔ گدا کی تو بھیک مانگنے کو کہتے ہیں۔
نصیب۔ ہمارے دشمن بھیک مانگتے ہیں۔ اور سچ پوچھو تو میں کہوں۔ پتیرا کی دشت
بھیک منگی ہے۔ اس میں ڈیرہ دار ہو۔ یا نہ ہو۔

میں۔ مان یہ تو سچ ہے۔ مگر مجھے نہیں معلوم تھا گدا کی کہتے ہیں۔

نصیب۔ سال میں ہم لوگ ایک مرتبہ گھر سے نکل کے گاؤں گاؤں بھرتے ہیں۔ ایز
ریشوں کے مکان پر جا کے اور ترے ہیں۔ جو کچھ جسکے مقدور ہوتا ہے۔ ہمیں دیتا ہے۔

کہیں مجری ہوتا ہے۔ کہیں نہیں ہوتا۔

میں۔ اچھا اسکو گدا کی کہتے ہیں۔ نصیب۔ مان۔ اب سمجھیں۔

میں۔ یہاں کسی رئیس کے پاس آئی ہوئی ہو۔

نصیب۔ یہاں سے غنڈی دور ہر ایک شیوہ صان سنگھ ایک راہ کی گڑھی ہے۔
او غنڈی کے پاس گئی تھی۔ راہ صاحب کو بادشاہی حکم ہو چکا ہے۔ ڈاکوؤں کے بدو
کو گئے ہوئے ہیں۔ کئی دن غمیری رہی۔ آخر دم گھبرایا۔ یہاں چلی آئی۔ یہاں سے

دو کوس پر ایک گاؤں سے گھریا۔ وہ گاؤں بالکل پتیروں کا ہے۔ وہاں میری
خالہ رہتی ہیں۔ کل ادن کے پاس جاؤں گی۔

میں۔ پھر کہاں جاؤ گی۔ دین غمیری رہوں گی۔ جب راہ صاحب جائیں گے تو پھر

گڑھی کو جاؤں گی۔ اور بہت سے ڈیرے بھی اونکی انتظار میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔
میں۔ کیا راہ صاحب کو ناچ جگر سے بہت شوق ہے۔

نصیب۔ بہت شوق تھا۔ میں۔ کیوں اب کیا ہوا۔

نصیب۔ جب سے ایک پتیرا لکھنؤ سے لائے ہیں۔ ہم تو کون کی کوئی تدبیر نہیں ہی
میں۔ ادس پتیرا کا کیا نام ہے۔

نصیب۔ نام تو بنگویا دھنیں۔ صورت دیکھی ہے۔ گوری گوری سی ہے۔ ذرا چہرہ
مڑے کی اچھی ہے۔

میں۔ گدا کی تو خوب ہو گی۔

نصیب۔ خاک۔ سلاوا دانا کچھ نہیں آتا۔ مان ناچتی ذرا اچھا ہے۔ راہ صاحب اسی
پر لٹو ہیں۔

میں۔ کہنے دونوں سے وہ پتیرا آئی ہے۔

نصیب۔ کوئی وجہ۔ نہیں ہوئے ہوں گے۔

رات کو میں نے فیصل علی سے راستے کی خرابی کا حال بیان کیا۔ او غنڈی نے
کہا خاطر جمع رکھو مجھے بندوبست کر لیا ہے۔

دوسرے دن ہم نہ اندھیرے ہم لال کچ کی سرائے سے روانہ ہوئے۔ نصیب کی سارا
ہمارے پیچھے پیچھے تھی۔ فیض علی گھوڑے پر سوار تھے۔ ہم اور نصیب باتیں کرتے
جاتے تھے۔ غنڈی دو چل کے سحر بہا ملا۔ نصیب نے دُور سے ہلکودہ گاؤں کھایا۔

سڑک کے کنارے کھیت تھے۔ او میں کچھ گواریاں پانی دے رہی تھیں۔ کچھ کھیت
بزار رہی تھیں۔ ایک ہڑائی چل رہی تھی۔ او میں آگے سڑی عورت دھوئی

باندھے پل ہٹا رہی تھی۔ ایک چڑے رہی تھی۔ نصیب نے کہا یہ سب پتیرا لیا
میں نے دل میں کہا۔ واہ۔ پیشہ بھی کیا۔ پتیرا اس قدر محنت جو مردوں سے بھل
آفران کو پتیرا ہونا کیا ضرورت تھا۔ مگر ان کی صورت میں بھی ایسے ہی کاموں کے لائق

ہیں۔ لکھنؤ میں جو کٹڑے والیاں وہی والیاں۔ گھو سنیں آئی ہیں اونکی شکل
بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ نصیب بہان سے نصیب ہوتی۔

کونئی دو کوس اور جا کے ایک نلیب ملا۔ جا بجا جھڑ۔ بڑے بڑے غار سامنے تری
 بکا کنارہ نظر آیا۔ دونوں طرف درز تک گنجان درختوں کی قطار تھی۔ جب ہم
 اس منبع پر پہنچے ہیں دھوپ اچھی طرح کھل چکی تھی۔ کوئی پہر بھرون چڑھا ہوگا
 اس سڑک پر سوار ہمارے اور کوئی راستے چلتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ چاروں طرف
 سنسانا تھا۔ ندی کے پاس چوبچ کے فیض علی نے گھوڑا آگے بڑھایا۔ میں
 روکتی کی روکتی رہ گئی۔ وہ یہ جا وہ جا۔ بہت دور نکل گئے۔ تھوڑی دور تک
 گھوڑا نظروں سے غائب رہا۔ پھر ندی کے اوس پار جا کے معلوم ہوا۔ ہماری گاڑی
 اوسی طرح چلی جانی تھی۔ گاڑی بان گاڑی ٹانگ رہا تھا۔ سائیس گھوڑے
 کے پیچھے درڑا چلا گیا تھا۔ اب میں ہوں اور وہ گاڑی بان ہے۔ اسنے میں دور
 میں نے دیکھا اوس پندرہ گنوار گاڑی کی طرف دوڑے ملے آتے ہیں۔ میں نے
 دل میں کہا۔ خدا خبر کرے۔ تھوڑی دیر میں گنواروں نے آکر گاڑی کو گھیر لیا۔ سب
 تلواریں باندھے ہوئے تھے۔ بندوقین کندھے پر تھیں۔ توڑے سنگ رہے تھے۔
 گنوار۔ (گاڑی بان سے) گاڑی روک۔ کون سے گاڑی میں۔
 گاڑی بان۔ یہ سواری بریلی سے آئی ہے۔ ادناؤ کا بھاڑا کیا ہے۔
 گنوار۔ روک گاڑی۔

گاڑی بان۔ گاڑی کیون روکین۔ خا نصاحب کے مان کی زنا می سواری ہے۔
 گنوار۔ کوئی مرد سنا تھ نہیں ہے۔
 گاڑی بان۔ مرد آگے بڑھ گئے ہیں۔ آتے ہوں گے۔
 گنوار۔ ادرونی بی صاحب گاڑی سے۔

ایک۔ پردہ کھول کے کہیں لو باہر کسنری تیریا تو ہے۔ ایک پردہ کون۔
 ایک گنوار آگے بڑھا۔ گاڑی کا پردہ اوٹ گئے مجھے گاڑی سے نیچے ادا ملا۔
 میں آدمی جھکو گھیر کے کھڑے ہو گئے۔ اسنے میں ندی کی طرف سے گرد اوٹھی۔
 گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ جب گھوڑے قریب آئے میں نے دیکھا آگے
 فیض علی کا گھوڑا ہے۔ پیچھے اور دس پندرہ سوار ہیں۔ گنواروں نے دیکھتے ہی
 بندوقین کی ایک بازو ماری۔ اس میں دو سوار اور دھکے گر پڑے۔ پھر تلواریں مینا

سے لین سوار سہا ہی بر آگئے تھے۔ ادھر سے بھی تلواریں کھینچ گئیں۔ دو ایک
 ہاتھ ملے ہوں گے تین گنوار اور دھکے زخمی ہو کر گرے۔ ایک سوار اور ادھر
 گنوار بھاگ نکلے۔ آچھا کہاں جاؤ گے۔ دیکھو ندی اوس پار کیا ہوتا ہے۔
 گنواروں کے جانے کے بعد میں پھر گاڑی میں بیٹھی۔ جس سوار کے زخم آیا تھا۔
 اوسکے پٹیاں کسی کیٹن۔ وہ بھی گاڑی میں میرے ساتھ بٹھایا گیا۔ گاڑی درڑا
 ہوئی۔ اب دو سوار ہماری گاڑی کے ادھر اور دھرا ہیں۔ کچھ آگے ہیں۔ کچھ
 پیچھے ہیں۔

فیض علی۔ (اپنے ساتھی سے)۔ بھائی فضل علی لکھنؤ سے کسی طرح بکھنا ہی نہیں
 ہونا تھا۔ بڑی مشکل سے جان بچھڑا کر آیا ہوں۔
 فضل علی۔ یہ نہیں کہنے۔ عیش میں پڑے تھے۔
 فیض علی۔ مان یہ تو کہو گے۔
 فضل علی۔ کہیں گے کیا۔ تھکے تھے تو ساتھ ساتھ ہے۔ ذرا بھلا بھی صاحب کو
 ہم بھی تو دیکھیں۔

فیض علی۔ آپ سے کوئی پردہ ہے۔ دیکھیے۔
 فضل علی۔ آچھا۔ ڈیرے پر چل کے باوراد دیکھیں گے۔

اسنے میں گاڑی ندی کے کنارے پہنچ چکی۔ کنارہ بہت اونچا تھا۔ جسکو
 گاڑی سے اونر کے پیدل چلنا پڑا۔ بڑی مشکل سے گاڑی دوسرے کنارے تک
 پہنچی۔ جوزخمی سوار گاڑی میں تھا۔ اوسکے زخم گاڑی کی کمان سے کھل گئے
 تمام گاڑی میں خون ہی خون تھا۔

ندی اوس پار جا کے زخم پھر سے باندھے گئے۔ گاڑی دھوئی گئی۔ پھر میں گاڑی
 میں سوار ہوئی۔ اب قریب دو پہرون کے آچکا۔ مجھے شدت سے جھوک لگی ہوئی
 تھی۔ گاڑی اوسی طرح چل رہی تھی۔ اون لوگوں کا ڈیرہ کہیں دکھائی نہ دیتا تھا
 ندی سے کوئی چار کوس پر جا کے ایک گاڑیوں کے پاس مانگ تھا۔ اس میں
 چھوٹا دار بان بڑی ہوئی تھیں۔ گھوڑے بدھے ہوئے تھے۔ لوگ ادھر اور دھرا
 تھے۔ کچھ لوگ کھانا پکا رہے تھے۔ یہاں آکر ہماری گاڑی چوبچئی۔ ہمارے ساتھ تھے

زخمی سوار کو میدان میں ڈال دیا۔ جہاں اور لاکشین پڑی ہوئی تھیں۔ وہ تو پتی جان لے کے راسے ریل کی طرف روانہ ہوا۔ مردمن کی مشکین کسی گین گرجی کی طرف روانہ ہوئے۔ گردھی دبان سے کوئی پانچ کوس غمی۔ غوروی دور جا کے راجہ صاحب اور اذن کے ساتھ کے اور لوگ ملے۔ راجہ صاحب خود گھوڑے پر سوار تھے۔ ہم لوگ سامنے گئے۔ سری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔
 راجہ۔ یہی بی صاحب لکھنؤ سے آئی ہیں۔

مین (ناٹھ باندھ کے) حضور تصور وار تو ہوں۔ لیکن اگر غور کیجئے تو ایسا تصور بھی نہیں۔ عورت ذات۔ جل خرب سے آگاہ نہیں۔ مین کیا جانتی تھی۔
 راجہ۔ اب اپنی بے قصوری ثابت کرنے کی کوشش کیجئے۔ حضور آپ کا نابت ہے جو بائیں پوچھی جائیں اوسکا جواب دیجئے۔

مین۔ جو حکم حاکم۔
 راجہ۔ لکھنؤ میں کہاں کہاں ہے۔ مین۔ کھمال کے پاس۔
 راجہ۔ جہاں خانم کا مکان ہے۔ مین۔ حضور وہیں۔

راجہ۔ (آدیوں کو اشارہ کیا) دیکھو ت کھڑے سے ایک بل گاڑی لے لو۔ لکھنؤ کی ڈنڈیاں ہیں۔ ہمارے دیس کی ستریاں ہوں کہ رات بھر محفل میں ناچیں اور رات کے ساتھ دس کوس تک ناچتی چلی جائیں۔
 مین۔ حضور کہ جند سلامت رکھے۔

آدی گئے۔ کھڑے سے گاڑی لے آئے۔ پیچھے گاڑی پر بٹھایا۔
 اور لوگ اسی طرح مشکین کے ہوئے ساتھ ساتھ تھے۔

گردھی میں چو بکروہ لوگ نہیں معلوم کہاں بھجے ہو گئے۔ مین کوٹ میں بلای گئی۔ ستریاں مکان رہنے کو دیا گیا۔ وہ آدی خدمت کو مقرر ہوئے۔ پکا پکا یا کھانا۔ پوریان بکریاں۔ بٹھائیاں۔ طرح طرح کے اجار کھانے کو۔ لکھنؤ کے چھوڑنے کے بعد آج رات کو کھانا سیر ہو سکے کھایا۔ دوسرے دن صبح کو معلوم ہوا کہ آدی قیدی لکھنؤ روانہ کر دیے گئے۔
 بکروہاں کا حکم ہے۔ مگر ابھی راجہ صاحب رخصت نہیں کر سکے۔
 ہر بھرون چڑھے راجہ صاحب نے بلایا۔

سوار دن کو دیکھتے ہی ایک آدمی اس پڑاؤ سے دوڑا گئے بڑھا۔ اوسنے کچھ فضل علی کے کان میں کہا۔ فضل علی کے چہرے سے تشویش کے آثار نظر ہوئے تھے۔
 وہ فیض علی کے پاس گھوڑا بڑھا کے آئے۔ فیض علی سے چپکے چپکے بائیں ہون۔
 فیض علی۔ آجھا دیکھا جائے گا۔ کھانا تو کھا لو۔

فضل علی۔ کھانا کھانے تک کی مہلت نہیں ہے۔ ایسے مین نکل چلو۔
 فیض علی۔ آجھا جب تک جھولداریاں ادا کھاڑی جائیں۔ گھوڑوں پر زین کے جائیں ہم لوگ کھانا کھالیں۔

مین گاڑی سے اوتری۔ ایک آب کے درخت کے نیچے دری بچھا دی گئی۔ سنان کی پتلیاں لاکے رکھی گئیں۔ غمی کی غمی روٹیاں موٹی موٹی تو گولوں میں آمین۔
 مین فیض علی اور فضل علی تین آدمیوں نے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے وقت اگرچہ چرون پر تشویش کے آثار تھے۔ مگر منی مذاق ہوتا جاتا تھا۔
 جتنی دیر مین ہم لوگوں نے کھانا کھایا۔ جھولداریاں ادا کھاڑے تو دن پر لاری گئیں۔ زین کے گئے۔

آخر کا فلد چل نکلا۔

دو ہی تین کوس گئے ہولنگے کہ بہت سے سوار اور پہلون نے آکر گھیر لیا۔
 ادھر بھی سب پہلے سے سجدے تھے۔ دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں۔ اس ڈرائی مین فیض علی سری گاڑی کے آس پاس رہے۔ مین گاڑی کے اندر بھی مٹی دعا میں بڑھ رہی ہوں۔ کلچر بافتون اور چھل راسے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی گاڑی کا پردہ کھول کے دیکھ لیتی ہوں۔ یہ گراہ گرا۔ آخر دونوں طرف سے بہت سے آدمی زخمی ہوئے۔ ہمارے ساتھ بچاں آدی تھے۔ راجہ دھیان کے آدمی بہت سے تھے۔ ایک پردس ٹوٹ پڑے۔ بہت زخمی ہوئے۔ فضل علی اور فیض علی موت پا کر نکل گئے۔ دس بادہ آدمی اور گرفتار ہوئے۔ انھیں گرفتار دون مین مین بھی غمی۔

ہم لوگوں کی گرفتاری کے بعد گاڑیاں نے منت سماجت کر کے رانی چل کی۔

زراجمہ - اچھا ہے مگر کیا فیض و افضل علی دونوں بدعاش محل گئے۔ اور بھارو
گزنا رہا ہے۔ گفتگو میں چو بھکر اپنی سزا کو چوبھین گئے۔ بیشک تمہارا کوئی قصور نہیں
ہے۔ مگر آئندہ اسے لگوں سے نہ ملنا۔ اگر تمہارا جی چاہے تو دو چار دن یہاں رہو۔
میں تمہارے گلے کی بہت قہر لیں سنی ہے۔

مین۔ (نصیب کی وہ بات یاد آئی کہ راجہ صاحب کے پاس لکھنؤ کی کوئی زبڑی ہے۔
 ہونا اوسے مری قرینہ کی ہوگی) حضور نے کس سے سنا۔

راجہ۔ اچھا۔ یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔

مخوڑی ویر کے بعد لکھنؤ کی وہ رنڈی طلب ہوئی۔ لکھنؤ کی رنڈی کون - خورشید بان -
 خورشید دوز کے مجھے لپٹ گئی۔ دونوں مل کے روئے لگیں۔ آخر راجہ صاحب
 کے خوف سے فوراً علیحدہ ہو کر سامنے سو رہ جیے لگیں۔ سارا دن سے طلب ہوئے۔
 رانی کی خیر نسکے بن نے ایک حسب حال غزل کہہ لی تھی بہت سے شعر تھے جو شعر
 اب یاد آنے میں سنائے جیتی ہوں۔ ایک شعر پر راجہ صاحب اور حاضرین جلہ
 بہت ہی محظوظ تھے غودی کا عالم طاری تھا۔ غنہ ل یہ ہے۔

قیدی الحب صیاد رہا ہوتے ہیں
 خوشنویاں جن زار رہا ہوتے ہیں
 لہجی جھوٹے قوری زلفٹ پھوٹے ہلکے
 کوئی ہم اسے ستم ایجاد رہا ہوتے ہیں
 حسرت اس خون کیسیری کہ خفا ہے صیاد
 آج ہم بادلِ ناشاد رہا ہوتے ہیں
 خاطرِ نازِ گہ صیاد کو برداشت نہیں
 باعثِ نالہ و فریاد رہا ہوتے ہیں
 غم دینا نہ یہی اور ہزاروں غم ہیں
 قیدِ ہستی سے کب آزاد رہا ہوتے ہیں
 کیوں نہ رشک سے ہمیں نازدہ گرفتاروں
 ہم تو اسے لادست پیدا رہا ہوتے ہیں

اے آواذِ محبت سے رہائی معلوم

کب اس پر غم صیاد رہا ہوتے ہیں

مغل سکنے راجہ صاحب نے پوچھا۔ ادا کیا نکاح ہے۔

خوشنید نے کہا: خود اٹھیں کی کہی ہوئی ہے۔ راجہ اور بھی خوش ہوے۔

راجہ۔ اگر اسبا جانتے تو ہم آپ کو ہرگز رونا نہ کرتے۔

مین - غزل سے حضور کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اسی کا نوا فوس ہے۔ مگر اب نہ حضور
مکمل دیکھے۔ اور لوندی آنند ہو چکی۔

ایکے بعد جلسہ برخواست ہوا۔ راجہ صاحب اندر رموئی کھانے چلے گئے۔ خورشید
سے مجھے خوب باتیں ہوئیں۔

خورشید - دیکھو میں میرا کوئی قصور نہیں۔ خانم صاحب سے اور راجہ صاحب سے
بہت دُور سے لاگ ڈانٹ تھی۔ راجہ صاحب نے کئی مرتبہ جھگڑا کیا اور خون نے
صاف اکا کر دیا۔ آخر عیش باغ کے میلے میں اون کے آدمی لگے ہوئے تھے۔ جھگڑ
زبردستی اٹھالائے جب سے میں یہاں ہوں۔ ہر طرح کی میری خاطر ہوئی ہے۔
سب طرح کا آرام ہے۔

مین۔ موئے گنوار و ن مین خوب تمہارا جی لگتا ہے۔

غور شنید :- یہ بات سچ ہے۔ گرم میری طبیعت کو جانتی ہو۔ روز ایک نئے شخص کے پاس جانا میرے بالکل خلاف ہے۔ دنان یہی کرنا پڑنا تھا۔ غام کو جانتی ہو۔ یہاں صرف راجہ صاحب سے سابقہ ہے۔ اور سب میرے حکم کے تابع ہیں۔ دوسرے یہ برا وطن ہے۔ یہاں کی ہر چیز مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے۔

ہین۔ تو مختار ارادہ لکھو جانے کا ہین ہے۔

غور بشید۔ مجھے تو محنت کرو۔ یہاں اچھی طرح ہوں۔ تم بھی یہیں رہو۔

زمین۔ یہاں فرزند ہوں گی۔ مجبوری کی اور بات ہے۔

خورشید۔ کتب جاوگی۔ مین۔

میں۔ جہاں خدا الہ جائے۔

اور شہید۔ ابھی کچھ دن رہو۔ مین۔ مان ابھی تو ہوں۔

ہندہ میں دن تک بن گڑھی بن دی۔ غور شہیدت دہانہ یعنی قحی۔ غور شہید کا
دل و دان لگا ہوا تھا۔ میرا جی بہت گھبرانا تھا۔ آخر راجہ صاحب سے میں نے عرض کیا۔
میں۔ حضور نے مجھے حکم دیا دیا ہے۔

راجہ۔ ہاں۔ تو چھپر کیا جانا چاہتی ہو۔

میں۔ جی ہاں۔ پھر لڑائی کو رخصت کیجئے۔ پھر حاضر ہو جاؤں گی۔

راجہ۔ یہ تو لکھنؤا خضر ہے۔ اچھا کہان جاؤ گی۔

میں۔ کا پور۔ راجہ۔ لکھنؤ نہ جاؤ گی؟

میں۔ حضور لکھنؤ کیا منہ لے کے جاؤں گی۔ خانہ سے کیسی شہر منگی ہوگی یا خانہ دانا
کیا کیا نہیں گی۔

اول تو میرا ارادہ لکھنؤ جانے کا نہ تھا۔ دوسرے یہ بھی خیال تھا کہ لکھنؤ جانے کو اگر
راجہ سے کہو بھی تو شاہ بد رمانی نہ ہوگی۔ کو نکہ و دان جانے سے غور شہید کا حال کچھ نا
شاید خانم کوئی آفت برپا کریں۔

راجہ صاحب میرے اس ارادے سے بہت خوش ہوئے۔

راجہ۔ تو لکھنؤ بھی نہ جاؤ گی۔

میں۔ لکھنؤ میں میرا کون بٹھا ہے۔ کھانے بچانے کا بندہ ہے۔ جہاں رہو گی
کوئی نہ کوئی فردا دن نکل ہی آئے گا۔ خانم کی فدیہ میں رہنا اب مجھے منظور نہیں۔
اگر وہاں رہنا ہو تو نکل کیوں آئی۔

میں نے راجہ صاحب کو بالکل غیب میں ولادیا کہ میں لکھنؤ پر گزرتا جاؤ گی۔

دوسرے دن راجہ نے مجھے رخصت کیا۔ دل شرفیان ادا ہم دے۔ ایک دن شاہ

دیا۔ ایک رومال۔ ایک رختہ۔ تین بیل۔ غرض کہ مجھے دیرہ داہرنا بنا دیا۔

ایک گاڑی بان اور دو اورادی میرے ساتھ کیئے۔ اونا ڈکوہ واندہ ہوئی۔ وہاں پہنچ کر

سلارو بھٹیاس کے مکان میں ٹھہری۔ راجہ صاحب کے آدمیوں کو رخصت کیا۔

صرت لگا ڈیوان رکھیا۔ ہر شام میں اپنی کوٹھڑی کے سامنے بیٹھی ہوں۔ سدا کرتے

باتے ہیں۔ بھٹیاریاں چلا رہی ہیں۔ میان مسافر اور صر اور صر نہکان جھانڈا ہوا

عقدہ پانی کو آہم۔ کھانے پینے کو آہم۔ گھوڑے ٹٹو کے لیے خیم کا سایہ....

اتنے میں کچھ کبابوں فیض علی کا سائیس چلا آتا ہے۔ سراسرے چائیک ہی سے ایک کھاہ
چھڑی۔ ہرے اداس کی جا کھین پوٹن۔ وہ کسبہ حایرے پاس چلا آتا۔ بائیں کرکے
پہلے سلارو چلا پوچھا اس کے بعد میں نے فیض علی کو پوچھا۔ اوسنے کہا۔ اونکو آب کی دنا
میں اسے کی خبر نہ لگتی ہے۔ آج رات کو ہر ڈوڑہ ہر رات کے ٹھوڑا جاتے تھے۔
یہ سن کے مرادوں دھڑکے لگا۔ وجہ یہی کہ مجھے اب فیض علی کا ساتھ منظور نہ تھا۔ سخت ٹھوڑا
کے واسطے کے بعد میں کچھ قحی اب کلا خلاصی ہو گئی۔ اونا زمین فیض علی کے لینے کا
سان گمان تک نہ تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ (پھر کت کا سامنا ہوا۔ دیکھ لیا بڑا بڑا۔
فیض علی میری جان نہ چھوڑ سکے۔ رات کو کوئی ڈوڑہ ہر رات کے فیض علی جان نہ مار
ہو گئے۔ معمولی بات جیت کے ہمارا دناؤ سے رو آگئی کا مشورہ ہونے لگا۔ بڑی دیر تک
باتیں رہیں۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ گاڑی بان کو رخصت کر دو۔ سائیس گاڑی پر بٹکا لگا۔
میں خود گھر چلے کو کچھ لون گا۔ چھ ٹھہری لگا ڈی سلارو بھٹیاری کے پاس چھڑ دو۔
راتوں رات لگتا اوسپا مارا دھڑو۔ اب میں کیا کر سکتی تھی فیض علی کے بس میں تھی۔ جو
ادھون نے کہا۔ مجھے چار دنا جائز منظور کرنا پڑا۔ فیض علی نے سلارو کو بلایا۔ کنا سے لگا
دیر تک بائیں کہیں۔ کوئی آدمی رات گئے اپنے ساتھ گھوڑے پر مجھے بٹا بائیں سے
باہر ہوئے۔ باقی چھ کوس زمین کا چلنا۔ رات کا وقت میرا بند ٹوٹ گیا۔ درون در
رہا۔ آخر جون نوں کر کے لگا کے کنا سے چھوٹے۔ بڑی شکل سے ناؤ تلاش کی۔ اوسپا
اوترے فیض علی سے کہا۔ اب کوئی غون نہیں ہے صبح ہوتے ہوتے کا نوڑ چھوٹے۔
فیض علی نے جھکو لٹھی محال کی سراہن اونا مارا خود مکان کی تلاش میں نکل۔ ٹھوڑی
دیر کے بعد کنا کہا۔ بہان ٹھہرنا شیک نہیں ہے مکان بنے ٹھہرا لیا ہے۔ وہاں چلی
پلو۔ ڈوڑی کر رہی کی۔

ٹھوڑی دیر میں ڈوڑی ایک پختہ عالی شان مکان کے دو درے پر ٹھہری فیض علی
سے ہم کو بیان اونا مارا۔ مکان کے اندر جا کے کیا دیکھتی ہوں کہ ایک دکان میں دو ٹھہری
چار پائیاں پڑی ہیں۔ ایک چٹائی بھی ہوئی ہے اور سپر ایک عجیب قطع کا فرش رکھا ہوا
ہے۔ جسے دیکھتے ہی تھک جاتے ہیں۔ مجھے غرت ہوئی۔ مکان کا قریہ دیکھ کے دل کو خوش
ہونے لگی۔ ٹھوڑی دیر کے بعد فیض علی سے کہا۔ اچھا تو میں بازار سے کچھ کھانے کو لے آؤں۔

میں نے کہا۔ بہتر مگر ذرا جلدی آنا۔ فیض علی بازار کو گئے۔ بن اوسی مکان میں آکیلی
بچھی بن۔

اب سنبھلے۔ فیض علی بازار کو جو گئے خود ہیں کے ہو رہے۔ آج آتے ہیں۔ کل
ایک گھڑی دو گھڑی۔ پھر دوہرہ کہاں تک کہوں۔ دو پہر گندی۔ غام ہوتے آئی۔
اڑاؤ میں ہر نام کھانا کھایا تھا۔ رات کو گھوڑے پر چلنے کی کان۔ نیند کا شمار صبح
سے نہ پر پٹا پانی تک نہیں پڑا۔ پھر اپان تک نہیں لایا۔ بھوک کے مارے دم کھلا جاتا
تھا۔ گھوڑی وزیر میں سورج ڈوب گیا۔ اندر چلے ہوئے کھا۔ آخر رات ہو گئی۔ باخدا اب
کیا کروں نہ کہوں دیا۔ اودھ بھیجی۔ اتنا بڑا دست ڈار مکان۔ چھائیں بچائیں کر رہا
ہے ہات خدا کی ذات اور میں اکیلی۔ یہ معلوم ہوتا تھا اب اس کو گھڑی سے کوئی
کھلا۔ وہ سناہنے والے والا ان میں کوئی ٹپل رہا ہے۔ کوٹھے پر۔ حم و حم کی آوازی۔
زینے سے کوئی کھٹ کھٹ اترتا چلا آتا ہے۔ دو پہر رات ہو گئی۔ رات تک لگنا کی
اور دیواروں پر چاندنی تھی۔ اب چاند بھی چھپ گیا۔ بالکل اندھیرا کھب ہو گیا
آخر میں دو شلے سے منہ لپیٹ کے پڑی۔ پھر کچھ کھٹکا ہوا۔ رات پہاڑ ہو گئی۔ کچھ
نہیں کشتی ہے۔ آخر جون فون کر کے صبح ہوئی۔

دوسرے دن صبح کو تو عجیب ہی عالم تھا۔ اب لکھنؤ کی قدر ہوئی۔ دل میں کتنی
باخدا کس مصیبت میں جان پڑی۔ لکھنؤ کا عیش چین اور اپنا کھڑا پاؤں تھا اب
ایک آوازی اور آواز کی سستہ۔ حقہ پان۔ کھانا۔ پانی۔ جو کچھ ہو۔ اور نہ نہ
اور دھڑکنے موجود۔ خلاصہ کہ آج بھی صبح سے دو پہر ہوئی اور فیض علی آئے
اس حالت میں اگر کوئی تنگست۔ بی بی ہار دیواری کی بیٹھنے والی ہوتی تو
ای کھٹ کھٹ کے مرجاتی۔ میرا اڑاؤ تو کھلا سوتا تھا۔ مگر میری سیکڑوں مردوں
میں بیٹھ چکی تھی۔ کا ہونہرہ ہی۔ لکھنؤ کے تو اکثر گلی کو چوں سے واقف۔ یہاں کی
بھی سہرا دیکھی تھی۔ بازار دیکھا تھا۔ اب میری بلا اوس خالی مکان میں بیٹھ گئی
مجھ سے کتنی لکھنؤ گلی میں مکمل گھڑی ہوئی۔ میں میں قدم گھمے گی
کہ کچھ نہ کیا ہوں کہ ایک شخص سرکاری دوروی پہنے گھوڑے پر سوار۔ دوسرے
بندہ برن اٹاڑا تھا۔ ان کے حلقے میں بیان فیض علی متدیان کسی بہن

سانے سے چلے آئے ہیں۔ یہ اجرا دیکھتے ہی میں سن سے ہو گئی وہیں ٹھکان گئی۔
ایک ایک قدم سو میں کا ہو گیا تھا۔ مگر خیریت یہ ہو کر ان لوگوں میں سے کسی
کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی۔ وہ کھلے ہوئے چلے گئے میں ایک گلی میں پرہی۔ گھوڑی در
جائے ایک تپائی سی گلی میں۔ اس گلی میں ایک مسجد تھی۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ
سب سے بہتر خدا کا گھر ہے۔ گھوڑی دیر میں جا کے ٹھہرنا چاہیے۔ دروازہ کھلا ہوا
تھا۔ میں دانا اندر چلی گئی۔ یہاں ایک مولوی صاحب سے سنا ہوا کہانے سے
تھے۔ سر نہ ہوا تھا۔ ایک بلی تھی۔ باندھے ہوئے دھوپ میں ٹپل رہے تھے پہلے
تو شاید کچھ کہیں طاق بھڑے آئی ہوں۔ بہت سی خوش۔ جب میں جا کے کچھ
صحن کے کنارے پاؤں لگا کے بیٹھ گئی۔ تو قریب آئے بچھنے لگے۔ کیوں بیٹھا
آپ کا یہاں کیا کام ہے؟

میں۔ میں مسافر ہوں۔ خدا کا گھر کچھ کے گھوڑی دیر کے لیے بیٹھ گئی ہوں۔ اگر
آپ کو ناگوار ہو تو ابھی چلی جاؤں؟

مولوی صاحب اگر چہ بہت ہی سبے لگے تھے۔ مگر میری لگاؤ کی نظر اور دلچسپی
نے باوجود کا اثر کیا۔ جھلا جواب کیا منہ سے کھلا۔ بچا ناچار دھڑ دھڑ چھنے لگے۔ میں کچھ
کہہ دیا میں آگے۔

مولوی۔ (گھوڑی دیر کے بعد بہت سنبھل کے) اچھا تو آپ کا کہان سے آنا ہوا۔

میں۔ جی کہیں سے آنا ہوا۔ مگر افضل تو ہیں شہر کے کاراواہ ہے۔

مولوی۔ (بہت ہی گھر کے)۔ مسجد میں۔

میں۔ جی نہیں۔ بلکہ آگے حجرے میں۔ مولوی۔ لا حول ولا قوۃ۔

میں۔ ادبی۔ مولوی صاحب۔ مجھے تو مولیٰ آپ کے اور کوئی نظر نہیں آتا۔

مولوی۔ جی مان۔ تو میں اکبلا تو رہتا ہوں۔ اسی سے نہیں نے کہا۔ مسجد میں آپ کا کیا کام

میں۔ یہ کیا... خاصیت ہے کہ جہاں آپ رہتے ہیں۔ وہاں دوسرے نہیں رہ سکتا۔

مسجد میں ہمارا کچھ کام نہیں۔ یہ خوب ہی۔ آپ کا کیا کام ہے۔

مولوی۔ میں تو ان کے بڑھانا ہوں۔ میں۔ میں آپ کو سب سے دو گئی۔
مولوی۔ لا حول ولا قوۃ۔

میں۔ لا حول ولا قوۃ۔ بآپ ہر دفعہ لا حول کہوں پڑتے ہیں۔ یہ کیا شیطان آپ کے پیچھے پھرتا ہے۔

مولوی سید سلطان آدمی کا دشمن ہے۔ اس سے ہر وقت ڈرنا چاہیے۔

میں۔ خدائے ڈرنا چاہیے۔ شمس سلطان سے کیا ڈرنا۔ اور کیا آپ نے کہا آپ جی مولوی (ڈاکٹر کے) جی مان۔ اور کون ہوں؟

میں۔ مجھے تو آپ جن معلوم ہوتے ہیں۔ اکیلے ہیں سمجھ میں رہتے ہیں۔ آپ کا دل بھی نہیں گھبراتا ہے۔

مولوی پھر کیا کریں۔ یہیں تو اکیلے کی عادت ہے۔

میں۔ اسی سے تو آپ کے چہرے پر وحشت برسی ہے۔ وہ آپ نے نہیں سنا۔ تنہا نشین کہ جو دیوانگی ہے۔

مولوی۔ اسی وہ کچھ سی۔ ہم جس حال میں ہیں خوش ہیں۔ آپ اپنا مطلب کیجئے۔ میں۔ مطلب تو کتاب کے دیکھنے سے مل ہوگا۔ بالفضل زبانیاں باطل ہے۔

مولوی۔ ہر خوش۔ میں۔ جہاں ناسد۔

میں مولوی صاحب کو خوب مجھو دیاں دیتی۔ گراؤ وقت ہو کر کے اسے منہ سے بتا نہیں نکلتی تھی۔

رسوا۔ یہ مولوی صاحب سے استعد رندان کی کیا ضرورت تھی۔

امراؤ۔ ایسی ہی ابکا حال نہ ہو چکے ہوتے آدمیوں کی صورت ہی ایسی ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ ہٹنے کو بھی پاتا ہے۔

رسوا۔ جی مان۔ جیسے کسی کی سنڈی ہوئی کو تڑپی دیکھ کے ہٹے آدمیوں کی تہلی کھانی ہے جیت نکالنے کو جی پاتا ہے۔

امراؤ۔ اسی ہی کچھ لیجئے۔ رسوا۔ آجھا تو وہ مولوی صاحب میں ایسی کیا بات تھی جس سے زبان کرنے کو بھی پاتا تھا۔

امراؤ۔ کیا کہوں کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جو ان آدمی تھے۔ صورت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ سادہ رنگت تھی۔ چہرے پر کچھ حریفان سا تھا۔ لمبا قد تھا۔ سر پر لمبے لمبے بال تھے۔ منہ پر آدمی تھی۔ مگر کچھ بے شکہ ہون کی حد سے بھی زیادہ بڑی ہوئی۔ تو کچھوں کا بالکل

صفا تھا۔ بہت بہت اونچی بندھی ہوئی تھی۔ سر پر چھینٹ کی بڑی سی لوہی تھی جو سر کی پوری چوڑی کو ڈھانکتے ہوئے تھی۔ بات کرنے کا عجیب انداز تھا۔ منہ جلدی سے کھٹکھا تھا۔ پھر بند ہو جاتا تھا۔ نیچے کا ہونٹ کچھ عجیب انداز سے اوپر کھڑا ہوتا تھا۔ اور اگلے ساتھ ہی کٹھن دار داڑھی کچھ عجیب انداز سے ہل جاتی تھی۔ اگلے بعد ناک سے کچھ پونہ سا نکلتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے آپ کچھ کھا رہے ہیں۔ اور بائیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ اچھا طائفہ جلدی سے بند کر لیتے ہیں۔ کہ ایسا ہو کچھ نکل پڑے۔

رسوا۔ کیا واقعی کچھ کھا رہے تھے۔

امراؤ۔ جی نہیں۔ لنگائی کر رہے تھے۔

رسوا۔ اکثر کتنا کچھ ایسی ہی صورت بنا لیتے ہیں جسے دیکھ کے بے وفوں کو ڈر لگتا ہے اور غفلتہ دن کو نہ ہنی آتی ہے۔ مجھے اپنی صورت میں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ امراؤ۔ اور کیسے۔ آپ کی انداز کتنا دین ایک وصف اور بھی تھا۔ وہ یہ کہ کمر بند پھر لیا کرتے۔

رسوا۔ یہ تو میں نیز داری ہے۔ اس لیے کہ منہ تو آراپ کے منہ سے نکل اڑتا ہوگا۔ امراؤ۔ کچھ اور بھی عسر من کردن۔

رسوا۔ بس لب معات ہیجے۔ یہاں تو صبح ہو گئی۔

امراؤ۔ اقصیٰ میں نے حیرت سے ایک روپہ نکالا۔

مولوی۔ (یہ کچھ کے کہ مجھے نذر دیا جاتا ہے۔ جلدی سے ہاتھ توڑا دیا اور منہ سے) ابکی کیا ضرورت تھی۔

میں۔ (شکر اٹکے) ابکی اندہ ضرورت تھی اس لیے کہ مجھے ہو کر گئی ہے کسی سے کچھ کھانا نیکو ہو گیا۔ مولوی۔ (اب مجھے ذہن بات بنانے لگے) میں سمجھا۔ (میں نے دل میں کہا مجھے

کیا خاک۔ سمجھتے تو پتھر کے ہو جاتے) ابی سے ہو کر ہمارے ابکی کیا ضرورت تھی کیا کھانا یہاں نہیں ملتا۔

میں۔ امکان بالقوہ۔ بل۔ بالفعل۔ بالذات۔ یا بائیرا۔

مولوی۔ بالفعل تو ممکن نہیں۔ میرا ایک شاگرد کھانا لانا ہوگا۔ آپ بھی کھا لیجئے گا۔

میں۔ بالفعل ممکن نہیں۔ بالذات کی آپ کو تو فیمن نہیں۔ اور یہاں ضرورت نے

اصل میت کو جواد کا حکم دے دیا ہے۔ لہذا بازار سے کچھ لاد بیٹھے۔
مولوی۔ ایک ذرا صبر کیجیے۔ کھانا آتا ہی ہو گا۔

مین۔ اب صبر کرنا حکایت والا بھلاں ہے۔ اور دوسرے مین نے باجمعت سنا ہے کہ
رمضان شریف ایک مہینہ تمام دنیا میں سیر کرتے ہیں۔ اور گیارہ مہینے اس سجدہ
مستکف رہتے ہیں۔

مولوی۔ ہوت تو فی نفس الامر میں کچھ نہیں ہے۔ مگر میرا ایک شاگرد کھانا لیکے آیا ہو گا
مین۔ اور فرض دہشتہ دوکان مالا گا۔ اگر کھانا آتا بھی تو وہ آپ کی ٹوٹ لایوٹ کے
لے بھی کافی ہو گا۔ میری شرکت اوس میں مینی چہ؟ اور میں وجہ کفالت بھی کرے تو آقا خدا
ارشاد الہیت کا مضمون ہے۔ تاثر یاق از عراق آورده شود۔

مولوی۔ آہ۔ آپ تو بہت قابل معلوم ہوتی ہیں۔

مین۔ مگر میرے زعم ناقص میں آپ کسی قابل نہیں۔

مولوی۔ واقعی ایسا ہی ہے۔ مگر۔۔۔۔۔
مین (بات نکات کے) مگر ایسے کہ یہاں تو آئین مل ہوا مگر پڑھ رہی ہیں اور آپ
لاطلاع تقریریں کر رہے ہیں۔

مولوی۔ اچھا تو میں ابھی لایا۔ مین۔ اللہ ذرا جلدی جائیے۔

خدا خدا کر کے مولوی صاحب گئے۔ اور کوئی گھنٹہ گزر گئے کے بعد چار غمیری روٹیاں
ایک ٹٹھی کے پیالے میں خورنا سا نیلا شوربہ لاکے میرے سامنے رکھ دیا۔ دیکھ کے جان بولی
مولوی صاحب کی صورت دیکھنے لگی۔ مولوی صاحب اپنے دل میں کچھ ادراہی سمجھے۔
مولوی صاحب (خود آٹھ سے جو گھنٹے سے ہے اور کوئی دھیلے کی کوڑیاں چادرے
کے کونے سے کھول کے سامنے رکھ دیے) سنے صاحب چار پیسے کی روٹیاں میں پیسہ
کا سالن ہے۔ دھیلا بھانج (زور پر کاخروہ) میں گیا۔ آپ کی وجہ آپ کے سامنے
موجود ہے۔ پہلے گن بیٹھے تو کھائے گا۔

مین نے پھر ایک مرتبہ مولوی صاحب کی صورت دیکھی۔ مگر بھوک بڑی ملا ہے جلدی
جلدی تو لے اٹھا نا شور و عکے جب دو چار واسے کھا چکی تو مولوی صاحب کی
طرف مخاطب ہوئی۔

مین۔ میں نے کہا مولوی صاحب کیا اس اڑے شہر میں ہی کھائے کو تھا ہے۔
مولوی۔ تو کیا یہاں کہیں کھنڈ کی طرح محمد کی دوکان ہے۔ جہاں پلاؤ۔ زندہ۔
آٹھ ہر تار رہتا ہے۔

مین۔ حلوائی کی دوکان تو ہو گی۔

مولوی۔ حلوائی کی دوکان یہ سجدے کے نیچے ہے۔

مین۔ تو پھر چار کوس جانا کیا ضرور تھا۔ دوپہر کے بعد آئے اور لیکے کیا آئے توے
کٹن کا راتب۔

مولوی۔ ایسا تو نہ کیجئے۔ آدمی کھاتے ہیں۔

مین۔ آپ ایسے آدمی کھاتے ہوں گے۔ باسی غمیری روٹیاں اور نیلا نیلا شوربا۔

مولوی۔ نیلا تو نہیں ہے۔ آچھا تو دہی لادوں۔

مین۔ جی نہیں رہنے دیجیے۔ معاف کیجئے۔

مولوی۔ پیسے کا خیال نہ کیجئے۔ میں اپنے پاس سے لائے دینا ہوں۔

مین کچھ جواب بھی نہ دینے پائی غمی کہ مولوی صاحب سجدے کے باہر چلے گئے اور ایک
آبجورے میں خدا جانے کب کا ٹٹھ کھٹا دہی اٹھا لائے۔ اور اس طرح سامنے لاکے
رکھ دیا گویا آپ نے غم کی گور پر لالت ماری۔

پھر طور میں نے وہ چاروں روٹیاں ادا گل گل کے کھائیں۔ اور کوئی بہ منی بھر کے
پانی پیا۔ وہ طور بہ اور دہی یونہی چھوڑ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پیسے کوڑیاں بھی
وہیں پڑے رہنے دیئے۔

مین ناقدہ دھونے کو ادھنی غمی۔ مولوی صاحب سمجھے سجدے سے آقاں ہوتی ہے۔

مولوی۔ آدہ پیسے اور کوڑیاں تو اٹھا لیجئے۔

مین۔ میری طرف سے سجدہ میں چراغی چڑھا دیجئے۔

منہ ناقدہ دھو کے اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ مولوی صاحب بائیں کرنے لگی۔

کاہنوز میں مولوی صاحب کی ذات سے جھکوبت آ رہا تھا۔ ادھنیں کی معرفت ایک
کمرہ کراسے پر لیا۔ نوادھی پٹنگ۔ دری۔ چاندنی۔ چھت۔ پردے۔ تانبے کے برتن
اور سب ضرورت کا سامان خرید لیا۔ ایک اماکھانا پکانے کو اور ایک اوپر کے کام

کاج کو اور دو غنہ حکار ذکر رکھ لینے۔ غلطی سے رہنے لگی۔ اب سا زندگی کی تلاش ہو کر
یون تو بہت سے آئے۔ مگر کسی کا باج پسند نہ آیا۔ آخر لکھنؤ کا ایک طبیب مل گیا۔ چلیدہ جی
کے نامہ ان کا شاگرد تھا۔ اس سے خوب پرگت ملی۔ اسی کی معرفت دو سالہ لکھنؤ کے کانپور
کے ذرا کچھ دھارے۔ ملو آئے۔ ملائے دست ہو گیا۔ خوب کوہڑ پڑ پڑا ہر رات گئے تک
کمرے پر کمانے بجائے کچھ چارہ رہے لکھا۔ شہر میں یہ خبر ہو کر لکھنؤ سے کوی دیکر
آئی ہے۔ اکثر رو آدمی آئے گئے۔ شاعری بھی خوب چمکی۔ کوئی دن ایسا ہی بہت
ہو گیا جس کی طبع میں جانا ہوتا ہو۔ بھرے کثرت سے آتے تھے۔ ٹھوڑے ہی دن
میں بہت سا روپیہ کما لیا۔ اگرچہ کانپور کے لوگوں کا راہ روئے۔ بول۔ بال۔ مجھے
پسند نہ تھا۔ بات بات پر لکھنؤ یاد آتا تھا۔ مگر دھارے کی زندگی میں کچھ ایسا مزا ہے کہ
وہ اس جانی کو بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر لکھنؤ جاؤ گی تو میری خانم کی زوجہ
سبک رہنا پڑے گا۔ کیونکہ اس پیشے میں دیکر لکھنؤ میں خانم سے علیحدہ رہنا کسی طرح
ممکن نہ تھا۔ ایک تو اس سبب سے تمام زندگی نام کا دباؤ جانتی تھیں۔ اگر میں
اٹک ہو کے رہتی کوئی مجھے نہ ملتی۔ دوسرے عہدہ سا زندگی کا بہم چھوٹنا دھار
تھا۔ ناع بخیرے کا ڈھیر کو نہ کر مل سکتا تھا۔ جن کس کاروں میں میری رسانی ہوئی تھی
وہ بھی خانم کی وجہ سے تھی۔ اگرچہ میرا شمار اچھی کلاس والوں میں تھا۔ مگر لکھنؤ میں
اس کام کے کرنے والے بہت سے ہیں۔ اچھے بڑے کا امتیاز خاص لوگوں کو ہوتا ہے۔
عام لوگوں میں نام بکتا ہے۔ بڑے آدمیوں کی نگاہ اکثر اونچے ہی مکر رہ جاتی ہے۔
اس حالت میں مجھے کون پوچھتا۔ کانپور میں میرے وصلے زیادہ میری نذرانی
ہوتی تھی۔ کسی امیر رئیس کے ان کوئی تقریب شادی بیاہ کی ہوتی تھی۔ جس میں پل
بلا با عیث فخر نہ سمجھا جاتا ہو۔ باہر جا کر اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ کی حالت
ہے۔ یہاں ایک صاحب حضرت شادرن لکھنؤی بہت شہور ہیں۔ استاد اسلام اللہ
سمجھے جاتے ہیں۔ سیکڑوں آپ کے شاگرد ہیں۔ لکھنؤ میں کوئی ایسا نام بھی نہ جانتا ہوگا
ایک دن کا تذکرہ سنیے۔ ایک صاحب میرے کمرے میں شریف لائے۔ اشنا کہ
لکھنؤ میں شعر شاعری کا کچھ چرچا تھا۔ چھوٹے ہی ادھون نے پوچھا۔ آپ حضرت
شادرن لکھنؤی کو جانتے ہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ کون شادرن۔ یہ صاحب

اور نیکے شاگردوں میں تھے فوراً بگڑ گئے۔
وہ صاحب۔ میں تو سنتا تھا آپ لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔
میں۔ جی ان غریب خانہ تو لکھنؤی میں ہے۔
وہ صاحب۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ لکھنؤ میں رہتی ہوں اور حضرت
ادستاد کو مد جانیں۔

میں۔ لکھنؤ کے شہور شاعر دن میں کون ایسا ہے جس کو میں نہ جانتی ہوں۔ استاد دن
کا نوکری کیا ہے۔ اونکے نام برادر وہ شاگردوں میں سے بھی کوئی کم ایسا ہوگا جس کا
کلام میں نہ نہ سنا ہو۔ دن کے نام نامی سے تو مطلع فرمائیے۔ یہ غلط تو میں نے بھی نہیں سنا
وہ صاحب۔ (میں نہیں ہو کے) نام لینے سے کیا فائدہ۔ غلط شرف سے غریب اور شمال
سے جنوب تک زبان زد غلام ہے۔ ہاں ایک آپ نہیں جانتیں۔ نہ جانیں۔
میں۔ حضور جان کیجئے گا میرے نزدیک تو یہ شاعر نہ تھی ہے۔ مگر آپ کے اوستا اوستا
آپ کو ایسا ہی کہنا چاہیے۔ اچھا نام نامی سے تو مطلع فرمائیے۔ ممکن ہے کہ میں نے غلط
نہ سنا ہو۔ نام سے واقف ہوں۔

وہ صاحب۔ میرا شتم علی صاحب شادرن۔

میں۔ اس نام سے تو بیشک کان آشنا ہیں۔ (اچھا کہہ کے اب میں نکل کر رہنے لگی۔ یا جی
یہ کون میرا شتم علی صاحب ہیں آخر ایک صاحب پر کشتیاہ ہوا) آپ کے اوستا
مزید خوانی بھی تو کرتے ہیں۔ آ۔

وہ صاحب۔ جی ان مزید خوانی میں بھی کوئی ادب کا شغل و نظیر نہیں ہے۔

میں۔ بجا ارشاد ہوا۔ میں میرا صاحب اور مرزا صاحب سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔

وہ صاحب۔ انجمن صاحبوں کے ہم عصر ہیں۔

میں۔ بھلا کہ کا مزید پڑھتے ہیں۔

وہ صاحب۔ کسی کام میں کون پڑھنے لگے خود تعریف فرماتے ہیں۔ ابی سنائی دینا

رب کو نیا مرثیہ پڑھتے تھے۔ تمام شہر میں پھرا ہے۔

میں۔ مطلع تو آپ کو یاد ہوگا۔

وہ صاحب۔ مطلع تو نہیں۔ تلواری کی تعریف میں ایک بند پڑھا تھا۔ وہ مجھے کیا تمام

شہر کی زبان پر سے۔ ظلم توڑ دیا ہے۔

میں۔ ذرا ارشاد کیجئے گا میں بھی مستفید ہوں۔

وہ صاحب۔ وہ کلی غلاب دوسے تفسیر ہو رہی۔

میں۔ یہاں اللہ اس بندے کو دُور دُور سے پہرے ہیں۔ پانچ مصرعے مجھے سنائیے۔

واقعی کیا کلام ہے۔

وہ صاحب (بیت ہی خوش ہو کے) جی مان۔ آپ نے یہ مثنوی لکھو میں سنا ہو گا۔ دی

نوبت کہتا تھا کہ لکھو کی رہنے والی۔ اور پھر خیر و سخن کا شوق۔ حضرت بابر کو نہ جانتی ہوتی

نجب سے۔ اچھا اب میں بھی۔ یہ زمان تھا۔

میر سے جی میں تو آیا کہدوں کہ آپ کے استاد مر کے بھی جی میں گے تو ایسا بندہ میں کیسے

مرازا دیر صاحب (مروم) کا کلام ہے۔ مگر کچھ کچھ جھک چپ ہو رہی۔

رسوا۔ واقعی آپ نے بڑی غلطی کی۔ درجہ چارہ کی رودی میں خلل آتا میر شہر علی

صاحب بابر پر کیا موقوف ہے۔ اکثر صاحبوں کا بھی شواہد ہے۔ دوسروں کا کلام بار

جا کے اپنے نام سے پڑھتے ہیں۔ جذبی رو کا ذکر ہے۔ ایک صاحب میر سے ایک دوست

کی غزلوں کے سوا دوسے کچھ نہ لکھتے۔ حمد آباد کو کن میں سناتے تھے۔ بڑے بڑے

لوگوں سے داد لی مگر کچھ نہ لکھتے۔ لکھو میں غلط ہے۔ اصل صنعت سے نکلے

ہوا۔ وہ ہنس کے چپ ہو رہے۔ اکثر صاحبوں نے لکھو کو ایسا بدنام کیا ہے۔ کہ اب لکھو کی

اپنے نام کا قصص کے ساتھ لکھتے ہوئے غم آتی ہے۔ ایسا ایسے بزرگ لکھو لکھتے ہیں۔

جکی ہتھ دھتھ دیات میں لگا گئی۔ خود لکھو میں چند درجہ غلطی کیسی اور سلیسے سے

آگے رہے۔ اچھے خاصے لکھو بن گئے۔ اگرچہ کچھ ایسی غزل کی بات ہیں مگر حشو

سے کیا فائدہ۔

اعراؤ۔ جی مان۔ اکثر صاحب اسی طرح لکھو فروشی کر کے اپنا بھلا کرتے ہیں۔ کانور میں

بھی جیک ہی حال تھا۔ اوس زمانے میں ریل تو تھی نہیں۔ اور نہ لکھو کو کوئی باہر جانا

تھا۔ بلکہ ہر شہر کے کالین تلاش مینٹ میں ہیں آنے تھے۔ اسے کمال کی مسیحیت

داد دیتے تھے۔ وہی اجڑ کے لکھو آباد ہوا تھا۔

رسوا۔ فی دانا ہی حال دکن کا ہے۔ لکھو اور جس کے دکن آباد ہوا۔ میں تو گیا نہیں مگر کچھ

کے محلے لکھو والوں سے آباد ہیں۔

اعراؤ۔ جو صاحب لکھو ہوئے کا دعویٰ کرتے ہیں ان سے کہیے پہلے اپنی زبان کی بھائی

رسوا۔ کیا خوب بات کہی ہے۔ دوسری روئے کو کسی قدر ابھی مانا ہے۔ مگر بوجہ نہیں آتا۔

اتفاقات زمانہ سے یہ کچھ دور نہیں۔

یوں بھی ہوتا ہے کہ کچھ سے ہوئی جملے میں

بچھڑے ہوئے جملے ہیں اور پھر کب کے بچھڑے ہوئے۔ وہ جسکے کسان گمان بھی نہ

ایک دن کا واقعہ سنئے۔ کانور میں رہتے ہوئے کوئی چھ مہینے گذر گئے ہیں۔ اب غہرت کی

بہ حد چوٹی ہے کہ کانور میں اور بھلون میں میری کافی ہوئی غزلیں لوگ کھاتے پھرتے ہیں

خام کو میرے کمرے میں بہت اچھا جمع رہتا ہے۔ گریوں کے دن ہیں۔ کوئی دوسرے کا

وقت ہو گا۔ میں اپنے ہتھک پراکلی لیشی ہوں۔ اماں ماں میری غلنے میں غزلیں لے رہی

ایک خدمتگار کمرے کے باہر بیٹھا کھلے کی ڈوری کھینچ رہا ہے جس کی مٹیاں خشک ہو گئی

ہیں۔ میں آدمی کو آواز دیا میری چاہتی تھی کہ بانی چھڑک دے کہ اتنے میں کمرے کے چھپی

نے کچھ ہو گا۔ لکھو سے جو غزلیں آئی ہیں اور کچھ لکھو سے۔ کچھ لکھو سے۔ کچھ لکھو سے۔

کمرے کے نیچے تھی (جو اب دیا۔ مان ہی کمرے سے۔ پھر دریافت کیا۔ دروازہ کہاں ہے۔

اوسے بنا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑی بی کوئی شہر برس کا ہیں۔ گوری سی۔ مندر

چتر پان بڑی ہو میں۔ بال سب سے روٹی کا کھاؤ۔ کچھ لکھو ہوئی۔ سفید لکھو کا اور کچھ مندر

کا کرد۔ میں سکھ کا پا جامہ بڑے بڑے ہاتھوں کا پہنے۔ آخر میں ہانڈی کے موٹے

موٹے کپڑے۔ اور بھلون میں انکو شہان۔ جریب ہاتھ میں۔ ہاتھ کی پٹنی ہوئی ہیں۔

اور سارے فرش پر جھینگٹن۔ ایک کا سا لڑکا کوئی اس بارہ برس کا اوسکے ساتھ تھا۔

وہ کھڑا رہا۔

بڑی بی۔ لکھو سے تمہیں آئی ہو؟

میں۔ جی مان۔ اچانکہ کے میں ہتھک کے بچے اور آئی۔ پانچ ان کے کچھ لکھو آدمی

نکٹے سے آئے اور دی۔

بڑی بی۔ ہماری بیگم نے تمہیں یاد کیا ہے۔ لڑکی سا لکھو ہے۔ زنا دیکھ رہا تھا۔

جوا کیا ہے؟

مین۔ بیکم صاحب مجھ کو کیا جانیں۔

بڑی بی۔ اسے تمام شہر میں ٹھانڈے کھاتے کی دھوم ہے۔ دوسرے تمھارے بلائے کا یہ بھی ایک سبب ہے کہ بیکم صاحب بھی گھنوں کی رسنے والی ہیں۔

مین۔ اور آپ بھی تو گھنوں کی ہیں۔

بڑی بی۔ حقے کیونکر جانا۔ مین کہیں بات حیت کا قرینہ چھپا رہا ہے۔

بڑی بی۔ مان میں بھی دین کی رسنے والی ہوں۔ اچھا تو اپنا مجسرا تو بتاؤ۔ آجی بہت کام پڑا ہوا ہے۔ مجھے دیر ہوتی ہے۔

مین۔ مجرا تو میرا کھلا ہوا ہے۔ سب جانتے ہیں۔ پچاس روپیہ فی ہون۔ مگر بیکم صاحب گھنوں کی رسنے والی۔ اور اوغھن سے قدر کر کے بٹا یا ہے تو اون سے کچھ نہ لون کی جگہ کچھ بڑی بی۔ آج شام کو۔ آچھا تو یہ روپیہ کچھ دی کا تو لو۔ باقی دان آکے سمجھ لینا۔

مین۔ (روپیہ لے لیا) ابھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر اس خیال سے کہ بیکم صاحب نماز میں روپیہ لیے یعنی ہون آجھا۔ اب یہ کہیے کہ کھان کہاں ہے۔

بڑی بی۔ مکان تو دروازہ سے پہنچ جین ہے۔ یہ لڑکا ہر شام آئے گا۔ اسی کے ساتھ چل آنا۔ مگر ایسا خیال رہے کہ کوئی مرد ذات تمھارے لئے والوں میں سے ساتھ نہ ہو۔

مین۔ اور سازندے؟

بڑی بی۔ سادہ سے۔ خدنگار۔ ابھی سنا ہی نہیں ہے۔ کوئی اور نہ ہو۔

مین۔ جی نہیں۔ یہاں میرا کون ایسا ملاقاتی ہے جسے ساتھ لاؤں گی۔ خاطر جمع رکھیے۔

انہیں نے خدنگار سے خدنا کیا کیا۔ مین نے انارہ کیا۔ بڑی بی کے سامنے گلا دو۔ بڑی بی خدے لے لیکے خدہ پینے لگیں۔ مین نے ایک ہان پر کھڑے ہونا لگا کے ڈیون کا چور ڈیون پڑا ہوا تھا۔ ایک چٹکی اوسکی اور لاچکی کے دے پاننان کے ڈھکنوں پر چٹکی کے گھڑی بناسکے بڑی بی کو دینے لگی۔

بڑی بی۔ مائے بیٹا دانت کہاں سے لائون جو ہان کھاؤں۔

مین۔ آپ کھائے تو مین نے آپ ہی کے لاف پان بنایا ہے۔

بڑی بی۔ سمجھ گئیں۔ ہان لے کے کھایا۔ بہت ہی خوش ہوئیں۔ دھارے ہمارے شہر کی

تیزداری۔ آنا کہہ کے دعائیں دینی ہوئی رخصت ہوئیں۔ چلتے چلتے کہ گئیں۔ ذرا دن سے آجانا۔ گھڑی بھر دن سے کہہ لگا جانی لگی۔

مین۔ اگرچہ مجھ کا یہ دستور نہیں ہے۔ مگر خیر بیکم صاحب نے یاد کیا ہے۔ تو میں سویرے سے حاضر ہو کرے مبارکباد کاؤں کی۔

واضحی وطن کی قد باہر جا کے ہوتی ہے۔ کاہور میں سیکڑوں جگہ بچے ہوئے۔ مگر انہیں جانے کا ایسا اشتیاق ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ جی پاشا تھا کہ بلدی سے شام ہو جائے اور مین روانہ ہوں۔ گریوں کا دن پہاڑ ہونا ہے۔ خدا خدا کر کے اوتنا دن کٹا۔ پانچ بیٹے بچے لڑکا آجود ہوا۔ مین پہلے ہی سے بیٹنی مٹی تھی۔ سادہ دن کو بڑا رکھا تھا۔

سے انوں کے مکان کا پناہ دیا۔ مین سواہ ہو کے روانہ ہو گئی۔

بیکم کا مکان شہر سے کوئی گھنٹہ بھر کا راستہ تھا۔ چھ بیٹے مین دمان بھونجی۔ ہر کے کنارے ایک باغ تھا۔ جسکے چاروں طرف بند پرنہ لگی تھی۔ اور دوسرے غاردار وخت ہونے سے بار بھائے گئے تھے۔ جس سے دیوار سی بن گئی تھی۔ باغ کی قطع بالکل اگر دی تھی۔

ناڈ۔ کچھ اور طرح طرح کے خوبصورت درخت تھے۔ درختوں پر سرخی گئی ہوئی تھی۔ چاروں طرف سبز تھا۔ جا بجا ٹنگڑوں کی پہاڑیاں سی بنی ہوئی تھیں اور پھر انواع و اقسام کے پہاڑی درخت پھروں کے اندر سے اوسکے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ پہاڑیوں کے گرد اگر دھوب جانی گئی تھی۔ باغ میں ہر جہاں طرف بچے رہے تھے

ہوئے تھے اور مین صاف مٹی سا پانی پڑتا تھا۔ مانی تلون اور نوراون کے درمیان پانی دے رہے تھے۔ بتوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ دن بھر کی دھوپ کھائے ہوئے پھولوں میں جواب پانی پہنچا تھا۔ کیسے تر و نازہ اور شاداب تھے۔ ساگرہ کاہرم کوٹھی میں ادا ہوا تھا۔ عورتوں کے گلے کی آواز آئی۔ باہر مین نے مبارکباد کاؤں کی۔ پھر چڑ ہی آہٹام کلایا

کی ایک چیز شروع کر دی۔ کوئی سننے والا نہ تھا۔ آپ ہی آپ گایا کی۔ پھر چڑ ہو رہی۔ بیکم صاحب نے ایک کپڑے کی اور پانچ روپیہ انعام کے بھیجے۔ غور ڈی ویر میں شام ہو گئی۔

چاند کھل آیا۔ چاندنی صہیل گئی۔ تالاب کے پانی میں ماہتاب کا عکس ہو جوں سے ہل کر عجب کیفیت دکھارنا تھا۔

باغ کے ایک کنارے پر بہت عالی شان کوٹھی تھی۔ وسط باغ میں ایک پختہ تالاب

بنا ہوا تھا۔ اسکے گرد و لائی پھولوں کے نام سے نہایت خوبصورتی سے سجے ہوئے تھے۔ یہی
 نالاب سے بڑا ہوا ایک ادھما چوڑا ڈھانچا۔ اسکے درمیان میں ایک مختصر سا ہوادار جو بیچک
 تھا۔ اسکے ستونوں پر رنگ آمیزی کی ہوئی تھی۔ اس نالاب میں ہرے پانی کے کرنا
 تھا۔ پانی کے گرنے کی آواز سے دل میں مشکل پہنچتی تھی۔ دائمی عجب عالم تھا۔ نام کا
 سہا نام دھت۔ ریشتری ہوا۔ رنگ رنگ کے پھولوں کی بہک۔ ایسی مضامین نے پہلے
 کبھی نہ دیکھی تھی۔ چوڑے پر سفید ہانسی کا فرش تھا۔ مسند تک لگا ہوا تھا۔ اسی کے سامنے
 ہم لوگ بیٹھے گئے۔ کوٹھی سے لیکر اس چوڑے تک کلاب کی سیلون سے ایک چٹنا سا بنا
 ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اسی کی ماہ سے بیگم صاحبہ فشریت لائی ہیں۔ سائے پلین لڑی
 ہوئی تھیں۔ چوڑے پر دو سبز دو گین روشن ہو گئیں۔ مجھے گلے کا حکم ہوا۔ میں نے
 کراہے کی ایک چیز شروع کر دی۔ بڑی ہر تک گھامی۔ اسے میں ایک ہری ہاتھن
 میں دو سبز کڑوں لٹے ہوئے باہر کھلی۔ مسند کے سامنے کھدے دیئے سادھون سے کہا۔
 تم لوگ وہ سامنے شاگرد پیش میں چلے جاؤ۔ وہیں کھانا بیچ دیا جائے گا۔ اب یہاں
 زناہ ہو گا۔ جب وہ لوگ اٹھ گئے۔ بیگم صاحبہ بامد ہوئیں۔ میں بیگم کے لیے ادریش
 کھڑی ہوئی۔ ادھون نے بھگوڑی بٹایا۔ غور مسند پر بیٹھ گئیں۔ مجھے سامنے بیٹھنا
 کیا۔ بن سلیم کر کے بیٹھ گئی۔ گھانے کے لیے حکم کی نظر تھی۔ اور بیگم کی صورت غور سے
 دیکھ رہی تھی۔ حیرانی نگاہ تماشا کر کے کوئی نہ
 صورت وہ دروہ ہے کہ دیکھا کرے کوئی

پہلے تو وہ باغ اور وان کی فضا دیکھ کے مجھے رستہ ان کا شہ ہوا تھا۔ گلاب تھیں
 ہو گیا۔ ہری میرے سامنے گاؤں لگی تھی۔ انک بکلی ہوئی۔ چوٹی گھر تک پڑی ہوئی
 سرخ و سفید رنگت۔ ادھما مغلہ کھنچی ہوئی بھون۔ بڑی بڑی آنکھیں کمال جیسے گلاب
 کی پٹان۔ لکھوئی ناک۔ چھوٹا سا دانہ۔ پتلے پتلے نازک ہونٹ۔ نئے جہر میں کوئی چیز ایسی
 دھنکی جس سے بہتر میرے خیال میں آسکتی ہو۔ اور ہر اعضا کا تناسب اور سبب کا اظہار
 کس قدر خوشنما تھا۔ سبک دھون و حزم میں ہری نظر سے گذر گئی ہیں۔ مگر میں نے اس بلا کی
 صورت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ غور شدہ سے بہت جھجک مٹی تھی۔ مگر کہاں غور شدہ
 کہاں وہ غور شدہ کی صورت میں پھر ڈھنکی پنا تھا۔ اور میں۔ ایسے دروہ بے شک

بھاری بھر کم پیمان۔ دوسرے غور شدہ ان کے سامنے کسی قدر بھڑی معلوم ہوتی تھی۔
 اڑکا کاٹنی سا نازک نازک چھرا بدن۔ اوسنے کہاں پایا۔ دوسرے اوسکی صورت پر لکھ پڑ
 اور اسی پرستی تھی۔ جب دیکھو بروگن۔ نئی نئی بیگم صاحبہ بہت ہی خوش مزاج معلوم ہوتی ہیں
 بات کرتی ہیں گویا سانس سے بھول جھرتے ہیں۔ ہر بات پر خود ہنسنے دیتی ہیں۔ مگر کسی کو کہا
 کلام نہیں۔ دائمی سادگی میں کلفت اور رنگت کے ساتھ شوخی انھیں میں دیکھی۔
 دو لہندوں کی خوشامد سب کرتے ہیں۔ مگر جن عورت ذات ہو کے کہتی ہوں۔ ایسوں کی
 خوشامد بھی اگر بے غرض کیلئے تو کوئی عیب نہیں۔

لباس اور زیور بھی اسی صورت کے لائق تھا۔ میں بسنتی ڈوپٹہ کندھوں سے ڈھاکا ہر اپکی
 کاٹلو کھٹنا پھٹنا شروع کرنا کا پا جامہ۔ کافون میں صرف یا قوت کے آؤ رہے۔
 ناک میں ہیرے کی کیل گھلے میں سونے کا سادہ طوق۔ ہاتھوں میں موتوں کی پھرن۔
 بازوؤں پر دو تھن۔ پاؤں میں سونے کی بیڑیاں۔ چہرے کی خوبصورتی تلباس کی
 سادگی اور زیور کی سادیت۔ یہ سب چیزیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں۔ اور میں
 نقش حیرت بنی بیٹھی تھی۔ بوز صورت دیکھ رہی تھی۔ میں اور میری صورت تو جیسی کہ
 ۱۰۰ سوخت آپ کے سامنے ہے۔ مگر میں ہی جیسے گا اونکی فوج بھی کسی اور طرف تھی
 بھی کہ دیکھ رہی تھیں۔ دو فون طرف سے گھاہن لای ہوئی تھیں۔ میرے دل میں
 بار ایک خیال آتا تھا۔ گراؤ کے اظہار کا موقع تھا۔ کہوں تو کوئی نہ کہوں۔ ایک ہری
 پس پشت کھڑی ہو گیا جھل رہی ہے۔ دوسرے کھڑی ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں چاندی
 کی کوٹہ ہے۔ دوسرے کے پاس خاصدان۔ بڑی ویر تکت بیگم صاحبہ نے مجھے بات
 کی اور میں نے بول سکی۔ آخر ادھون نے سلسلہ کلام اطرع سے شروع کیا۔
 بیگم۔ تمہارا نام کیسا ہے۔
 میں۔ (ہاتھ باندھ کے) ابرا۔
 بیگم۔ خاص لکھنؤ میں مکان ہے۔

میں۔ اور سوال کرتے اس طرح سے کیا گیا تھا کہ مجھے جواب دینا کسی قدر مشکل معلوم ہوا خصوصاً
 اس موقع پر پہلے کہ اگر کہتی ہوں کہ لکھنؤ میں مکان ہے تو ایک مطلب جو میرے دل میں
 تھا نہ ہوتا ہے۔ فیض آباد تانی ہون تو بے محل افشاں را کا خیال ہے جو بہت کج
 کج کے (جی مان پرورشش تو لکھنؤ میں پائی ہے۔ جواب دینے کو تو دیر لگ سکتا ہے

ہی یہ خیال ہوا کہ اب جو سوال کیا جائے گا تو پھر وہی وقت پیش آئے گی۔ میرا خیال غلط تھا
اس لئے کہ تو راہی بیگم صاحب نے بوجھا۔

بیگم۔ تو کیا پیدائش لکھنؤ کی نہیں ہے۔

مین۔ (اب جبران بول کر کیا جواب دون۔ توڑی دیر سکوت کیا۔ جیسے کچھ سنائی
نہ تھا۔ آخر اس بات کو ٹال کے) حضور کا دولت خانہ لکھنؤ میں ہے؟

بیگم۔ کبھی لکھنؤ میں تھا۔ اب تو کا پورا وطن ہو گیا۔

مین۔ میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ بیگم۔ کیوں؟

مین۔ (اس سوال کا جواب دینا بھی دشوار تھا کہ کون نصیب بیان کرنا) اب کیا عرض کروں
بیکار سمجھ کر رہی ہوگی۔ حال ناگفتہ بہ ہے کچھ ایسے ہی اتفاقات پیش آئے کہ لکھنؤ جانے کو
جی نہیں چاہتا۔

بیگم۔ چلو آج چٹا ہے۔ تو ہمارے پاس بھی کبھی چلی آیا کرو۔

مین۔ آنا کیسا میرا تو بھی سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اول تو آپ کی قدر دانی۔ دوسرے
یہ باغ۔ یہ فضا۔ مگر یہ کہ کوئی ایک بار دیکھے سارو دو یا مار دیکھنے کی ہوس نہ ہو۔ خصوصاً
مجاہد اسی غفلتی مزاج کی عورت کے لیے تو بہان کی اب وہاں آکر کس کا غور خاص رکھنی ہے۔
بیگم۔ اے بی۔ جین یہ جگہ بہت پسند آئے۔ آرام و آسائش۔ بہتات غذا کی دست
شہر کے کو سون دور۔ چار پیسے کا سودا لکھاؤ۔ تو آدمی جمع کا گیا گیا شام کو آتا ہے۔ چائیں
چھوٹیں۔ شیطان کے کان بہرے۔ کوئی بیار ہو تو جب تک حکیم صاحب شہر سے آئیں۔
بہان دشمن کا خانہ ہو جائے۔

مین۔ حضور اپنی اپنی طبیعت۔ مجھے تو بہت ہی پسند ہے۔ مین تو جانتی ہوں۔ مگر
بہان رہوں تو مجھے کسی چیز کی ضرورت ہی ہو۔ دوسرے۔ ایسے مقام پر بیار ہونا کیا ضرور
بیگم۔ جب مین پہلے پہل آئی تھی۔ تو میرا بھی یہی خیال تھا۔ کچھ دنوں بہان رہ کے معلوم ہوا
کہ شہر کے رہنے والے ایسے مقام پر نہیں رہ سکتے۔ شہر میں نہرا طرح کا آرام ہے۔ اور سب
باقون کو جانے دو جب سے (اب کلکٹ گئے ہیں۔ مارتون کو ڈر کے مارے بند نہیں آئی
اون تو خدا کے دیے سہا ہی پاسی۔ خدا کا اور وقت بھی دس بارہ مردوں کی ہیں۔ عورتوں
کو گھنٹی نہیں۔ مگر پھر غشی ہو گئے۔ مین تو دو بار دن اور رات دو گھنٹی ہوں۔ اگر تو اب بھی

آئے تو شہر میں کوئی مکان نے کے جا رہی تھی۔

مین۔ قصد رحلت ہو۔ آج کا فراج وہی ہے۔ ایسے ایسے دوسرا دل میں نہ لایا کیجے۔
شہر میں جائے گا تو قدر عافیت کھلے گی وہ گری ہے کہ آدمی کہے جاتے ہیں۔ درگ
بیماریاں۔ خدا پناہ میں رکھے۔

یہ باتیں پوری تھیں کہ اس نے مین ایک کھلائی نیچے کو لے کے آئی۔ مین برس کا دکھا
تھا۔ ماشا دافہ کورا۔ گورا۔ خولجورت۔ ایسی پیاری پیاری باتیں کرنا تھا۔ جیسے نیا۔
بیگم نے کھلائی سے لے کے گود میں بٹھا لیا۔ توڑی دیر کھلا کدے بھر کھلائی کو دینے
لگیں۔ مین نے ہاتھ بڑھا کے لے لیا۔ بڑی دیر تک بیٹے رہی اور پیار کیا کی پھر
کھلائی کو دے دیا۔

مین۔ (بیگم سے) دن تو شاید نہ بھی آئی۔ مگر میان کے دیکھنے کو تو ضرور ہی آؤ گی۔

بیگم۔ (سکرا کے) آج تھا کسی طرح ہو۔ آنا ضرور۔

مین۔ ضرور حاضر ہوں گی۔ یہ آپ کیوں بادیار فرماتی ہیں۔ مین تو اس قدر حاضر ہوگی
کہ حضور کو دو بھیس ہو جائوں گی۔

اسکے بعد اصرار دھری باتیں ہوتے لگیں۔ بیگم نے میرے کانے کی بہت فرہش کی
اسی اٹنا مین خاصہ والے نے آ کے کہا۔ خاصہ تیار ہے۔ بیگم نے کہا۔ چلو کھانا کھاؤ۔
مین۔ بہت خوب۔

بیگم مسند سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مین بھی ساتھ ہی اٹھی۔ میرا ہاتھ بکڑ لیا۔

ہر یوں کو اشارہ کیا۔ ہم کھانا کھا کے یہیں بیٹھیں گے۔

مین۔ واقعی اس وقت کا شہنشاہ تو اب اسے کہ جاتے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر حکم حاکم۔

بیگم۔ تو کیا کھانا بہین منگو لایا جاے۔

مین۔ جی نہیں۔ آج کھانا کھا کے چلے آئیے۔

بیگم۔ (ایک ہری سے) ان کے ساتھ کے آدمیوں کو کھانا دلادیا گیا۔

ہری۔ (ہاتھ باندھ کے) حضور دلوادیا گیا۔

آج اودھ میں رخصت کرو۔ مینے دوسرا مجرا معائن کیا۔ امرا و جان کھانا کھا کے بیٹھے
ایکے بعد بیگم اور ہم دونوں کو مٹی کی طرف چلے۔ ایک ہری آگے آگے فائوس لہو جاتی

جھکے سے میرے کان میں کہا۔ جگر تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ مگر آج ادھکا
موقع نہیں۔ کل تو مجھے فرصت ہونگی۔ پرسوں تم صبح سے آنا۔ اور کھانا یہیں کھانا
میں۔ مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے۔

بیگم۔ اچھا تو آئی کچھ نہ کہو۔ چلو کھانا کھا لیں۔ اس کے بعد تم مارا گا نا سنیں گے۔
میں۔ پھر سازندوں کو تو حضور نے رخصت کر دیا۔

بیگم۔ بلکہ مردوں کے ساتھ گانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میری ایک خواص خوب طبلہ
بجاتی ہے اور سپر گانا۔
میں۔ بہت خوب۔

اب ہم کو کھانے کے زینے کے پاس بھونچ گئے تھے۔ بہت وسیع کوٹھی تھی۔ اور اس طرح
سیٹنے سے سچی ہوئی غنی کرنا ہی کو بیٹوں کے دیکھنے کے بعد اگر کوئی کوٹھی دیکھی تو یہی
دیکھی۔ پہلے رآمدہ ملا۔ اس کے بعد کئی کمروں سے ہر ایک کے طرف سے
بھا ہوا تھا۔ ہر کمرے کا فرش فروکش اور شیشہ آلات ایک نئے رنگ اور نئے طرز کا تھا
آخر ہم اس کمرے میں بھونچے۔ جہاں دسترخوان چٹا ہوا تھا۔ دسترخوان پر دو عورتیں
اور منظر تھیں! ان میں سے ایک چٹھی نوپس تھی۔ ایک مصاحب۔ ان دونوں کا
لباس بھی بہت ہی نرین برن تھا۔ صورتیں بھی اچھی تھیں۔

دسترخوان پر کئی قسم کے پلاؤ۔ بورانی۔ فرختر۔ تنجن۔ سفیدہ۔ شیر برج۔ بافخانیان
کئی طرح کے نالن۔ کباب۔ اجارہ۔ مرے۔ مٹھائیاں۔ دی۔ بالائی۔ غرض کہ ہر قسم کی
نعمت موجود تھی۔ لکھو سے بچنے کے بعد کج کھانے کا فرمایا۔ بیگم ہر طرح کی چیزیں
میرے سامنے رکھتی جاتی تھیں۔ میں اگر کسی قدر تکلف سے کھانا کھاتی تھی مگر اس کے
امر سے ضرورت سے زیادہ کھلا دیا۔

میں دانی اور شلہ آیا۔ ہاتھ منہ دھو کے رہنے پان کھائے۔ پھر اسی چوڑے پر
جلے جا۔ اس جلیبے میں صرف بیگم صاحبہ تھیں۔ چٹھی نوپس۔ مصاحبین۔ خلائیان۔
مستحقین۔ ہریان۔ مائیں۔ سب ملا کے کوئی دس بارہ عورتیں تھیں۔

بیگم صاحبہ نے حکم دیا۔ بلبل کی چوڑی اور ستارہ اٹھا لاؤ۔ ایک مصاحب جو طبلہ بولنے
میں مشاق تھی طبلہ بجانے لگی۔ خود بیگم صاحبہ ساز چھڑنے لگیں۔ مجھے کھانے کا حکم ہوا۔

کھانا کھانے کھلائے گیا رہ بچکے تھے۔ جب ہم کھانے کو بیٹھے ہیں۔ ٹھیک بارہ بجے کا وقت
تھا۔ اور وقت وہ باغ جمین بہت سا دیوہ صرف کر کے بنگل اور ہاٹ کی گھاٹوں کے نوٹے
بنائے گئے تھے۔ عجب وشتناک سنان دکھارنا تھا۔ ایک طرف چانداس عالی شان
کوٹھی کے ایک گوشے سے ٹھوڑی دور پر گنجان درختوں کی شاخوں سے نظر آتا تھا۔ کراب
ڈوبے ہی کو تھا۔ تاریکی پر بخشنی پر چھائی مانی تھی جس سے ہر چیز بھیا تک معلوم ہونے لگی
درخت بننے اوٹھے تھے اس سے کہیں بڑے نظر آتے تھے۔ ہوا سن سن حل رہی تھی سرد
کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اور تو ہر طرف ٹھوڑی کا عالم تھا۔ مگر نالاب میں
پانی کے گرنے کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی پرندہ اپنے آشیانے میں چونک کر
ایک بانک بول دیتا تھا۔ یا شکاری جانوروں کی بول سے جو چڑیاں اور تکی تھیں
اوس سے نئے کھڑک جاتے تھے۔ یا کبھی کوئی پھلی نالاب میں اوجھل پڑتی تھی۔ بڑنگ
اپنا بے کاراگ کار رہے تھے۔ جھینگاں سے رہا تھا۔ سوائے اس چوڑے کے جہاں دس
بارہ جوان جوان عورتیں رنگ رنگ کے لباس پہنے اور طرح طرح کے رورے آ رہے تھے
طلسمہ جہائے بھی تھیں اور کوئی آس پاس نہ تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے کنول ٹھہر گئے
تھے صرف دور دوروں کی روشنی تھی۔ اونکے بھی شیشے سبز یا نارون کا عکس جو نالاب کے
پانی میں ہلکے سے رہا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ طلسمات کا عالم تھا۔ وقت اور مقام کی
ناسبت سے میں نے سوچی کی ایک چیز شروع کر دی۔ اس راگنی کے جھانک شروع
دلان پرانا پورا اثر کیا تھا۔ سب بہوت بیٹھے تھے۔

خوف کے مارے بلبل کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ خصوصاً گنجان درختوں کے نیچے اندھیرا گہرا
تھا۔ سب ایک دوسری کی صورتوں کو دیکھ رہے تھے۔ گویا وہ جلد سن کی جگہ تھی۔ اور
جدھر نگاہ اوٹھا کے دیکھو ایک ہو کا عالم تھا۔ اور دن کا کیا ذکر خود میرا کلیجہ دھڑک رہا
تھا۔ دل ہی دل میں کہتی تھی۔ بیگم نے سچ کہا تھا۔ بیشک یہ جگہ رہنے کے لائق نہیں ہے
اس اثنا میں گیدڑوں کے بولنے کی آواز آئی۔ اس نے اور بھی دونوں کو دہلا دیا۔ اس کے
بعد کتنے جھونکے گئے۔ اب تو مارے دہشت کے یہ حال تھا کہ کسی کے منہ سے بات نہیں نکلتی
تھی۔ اپنے میں بیگم نے گاؤنکے سے ایک ذرا اونچی ہو کے اپنے سامنے کچھ دیکھا۔ اور زور سے
ایک چار مار کے سند بڑ بڑا رہا۔ اور سب عورتیں بھی اسی طرف دیکھنے لگیں۔ لیکن کبھی نہ

دیکھنے لگی۔ بکیما صاحب کو جن سمجھ چکی تھی کہ وہی ہیں۔ مگر اب جو دیکھتی ہوں تو اودن کے
 وہم کی حقیقت نظر آئے لگی۔ سامنے سے دس پندرہ آدمی منہ پر ڈانٹے باندھے تنگی
 تلواریں ہاتھ میں۔ دوڑنے چلے آئے ہیں۔ عورتوں کے چلانے سے بیکم کے نوکر۔ چاکر۔
 خدمتکار۔ پاسی سبیل ہی طرف کو چلے کوئی ہنسا کسی کے ہاتھ میں لاشی۔ مگر ڈاکو دیا دہشت
 اور بہان آدمی کم غمے۔ کئی تو رستے ہی سے فرار ہو گئے۔ باغ چار آدمی چوتھے سے نکل
 چھوٹے ہی گئے۔ انھوں نے آگے عورتوں کو بچ بن کر لیا۔ اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو کر
 کھڑے ہو گئے۔ عورتوں میں سے کسی کو ہوش نہ تھا۔ سب غش کی حالت میں بیدم
 بڑی غمیں۔ ایک میں خدا جاتے کیا ہنصر کا دل تھا کہ بیٹھی رہی۔ اسے ہول کے دم
 نکلا جانا تھا۔ یا اللہ دیکھے کیا ہوتا ہے۔

بیکم کے آدمیوں میں سے جن کے پاس حرفے تھے۔ وہ آگے بڑھنے ہی کو تھے کہ سرفراز
 نے ایک سپاہی نے روکا۔

سرفراز۔ (اپنے ساتھیوں سے) ٹھہرو۔ ابھی جلدی نہ کرو۔ پہلے ہمیں ابن لوگوں کا منہ
 معلوم کرنے دو (ڈاکو دن سے) تم لوگ کس ارادے سے آئے ہو۔

ایک ڈاکو جس ارادے سے آئے ہیں۔ تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔
 سرفراز۔ وہی تو میں تو چھت ہوں۔ جان کے غوا مان ہو یا مال کے؟

دو سرا ڈاکو۔ ہمیں جان سے کوئی غرض نہیں کوئی باپ مارے کا بیڑ ہے۔ جان
 جس ارادے سے آئے ہیں آدمیوں تم فرام ہو کے تو دیکھا جائے گا۔

سرفراز۔ (کسی قدر سخت ہو کے) تو کیا ہو بیٹوں کی آبرو لوگے اگر یہ قصد ہو۔۔۔

سرفراز پوری بات ختم بھی نہ کرنے بابا تھا۔ کسی نے ڈاکوؤں کی طرف سے کہا۔
 کوئی ڈاکو۔ نا صاحب کسی کی ہو بیٹوں سے کیا واسطہ کیا ہمارے ہو بیٹیاں ہیں
 ہیں۔ عورتوں کے کوئی ہاتھ لگا سکتا ہے۔ اس آواز پر مجھے کچھ شبہ سا ہوا۔

سرفراز۔ (خوش ہو کے) ابھی یہی تو میں پوچھتا ہوں۔ اچھا تو بھائیو ہم ابھی غمیں
 کو مٹی کے کمر دن کی گنجان لگائے دیتے ہیں۔ اور جو عورتیں وہاں ہیں اونکو یہاں

بلوائے بیٹے ہیں۔ گھر کی مالک بیکم ہمیں موجود ہیں۔ تم ثنوں سے کو مٹی میں جاؤ۔
 جو جی چاہے۔ اور ٹھیک لجاؤ۔ رما عورتوں کا زیور۔ وہ بھی ہم اور دوائے دیتے ہیں۔ ہمارا

مالک کچھ اس سے غریب نہ ہو جائے گا۔ خدا کے حکم سے لاکھوں روپے بنک گھر میں جمع
 ہے۔ علانے سے جو روپیہ آتا ہے اسکا ذکر نہیں۔

ڈاکو۔ اس سے بہتر کیا ہے۔ مگر دیکھو اس میں کچھ دغا نہ ہو۔
 سرفراز۔ سپاہی کے ہوت دغا نہیں دیتے۔ خاطر جمع رکھو۔

وہی ڈاکو جسکی آواز میں نے پہچانی تھی۔ آگے بڑھا۔ واہ کیا کہنا۔ مردوں کا قول ہی
 تو ہے۔ آجھٹا تو گنجان۔۔۔

آنا کہا تھا کہ میرے اد کے بھائی چار ہوئیں۔ میں نے پہچان کر لیا۔ بولنے کا قصہ کیا۔
 مگر دل میں ایسی دہشت سمائی ہوئی تھی کہ منہ سے آواز نہ نکلی تھی کہ اتنے میں خود اسے
 آگے بڑھ سکے۔

”بھائی تم یہاں کہاں؟“
 میں۔ جب سے تمہارے بھائی قید ہو گئے ہیں ہوں۔

فضل علی۔ یہاں کیسے پاس۔
 میں۔ بہنی تو خیر میں ہوں۔ مگر یہاں میری ایک بہن بکیما صاحب کے پاس ذکر میں آئی

ہے آئی تھی۔
 فضل علی۔ تمہاری بہن کہاں ہیں؟

میں۔ بہن ہیں۔ جب سے تم لوگوں کے آنے کا ہنگامہ ہوا۔ بچاری غش میں پڑی ہیں
 میری طرح تو ہیں انہیں۔ بچاری پردہ نشین ہیں؟

فضل علی۔ پردہ نشین ہیں؟
 میں۔ جوانی میں رانڈ ہوئیں۔ جب سے امیر بیٹوں کی نوکریاں کرتی پھرتی ہیں۔

فضل علی (اپنے ساتھیوں سے) یہاں سے ایک پیسے کی چیر لٹا میرے نزدیک
 فوجرام ہے۔ اور نہ اس معاملے میں تمہارے ساتھ ہوں۔

ایک ڈاکو۔ کیا۔ بھراے کون تھے؟
 فضل علی۔ جس ارادے سے آئے تھے تمہیں معلوم ہے۔ مگر کسی کا کچھ خیال بھی ہے

مجھے تو نہیں ہو سکتا کہ فیضو بھائی کی آشنائیاں اور ادھی ہیں کا اسباب تو وہ ہیں۔ جس
 سرکار سے ابن لوگوں کا قتل ہو۔ وہاں دست دمازی کروں۔ اگر وہ زندہ نہ ہوتے تو

کیا کہے گا۔

اس بات پر ڈاکوؤں کے آپس میں بہت جھگڑا ہونے لگا۔ مگر سب فضل علی کا دباؤ ماننے تھے کوئی دم نہ مانتا تھا۔ پھر بھی غالی ماتھے پھر جانا کچھ ایسی پہل بات نہ تھی۔ سب ڈاکو قتل بچانے تھے۔ فاقون مرنے ہیں۔ کریں تو کیا کریں۔ ایک موقع ملا بھی تو اسے فاضل صاحب چھوڑ دیتے ہیں۔ آخر یہ کون سا کہاں سے پالیں۔

جب فضل علی اپنے گروہ سے کل کے الگ کھڑے ہوئے اور ان کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور شخص سیاہ فام سایہ پہنا ہوا نکلا۔

وہ شخص فاضل صاحب میں بھی گہرے ساتھ ہون۔ غور سے جو دیکھتی ہوں معلوم ہوا کہ فیض علی کا سائیس ہے۔ میں نے اسے پاس بلایا غلطہ لہجا کے باتیں کیں۔ وہ اشرفی اور درپے جو بیکھ صاحب نے انعام میں دے دیے تھے چپکے سے اسے دیدے۔ فضل علی (سرفراز خان سے) بھائی میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اب تم جاؤ اور یہ لوگ سرفراز۔ میں ان لوگوں کو ابھی راضی کیے دیتا ہوں۔ مگر یہاں سے چلو۔ غور میں پریشان ہو رہی ہیں۔ سرکار غش میں پڑی ہیں۔ زرا اوکو ہوش میں آنے دو۔ ہم فرم لوگوں کو غور میں کر دیں گے۔

ڈاکو دمان سے چلے گئے۔ بیگم صاحب ابھی تک بیہوش پڑی تھیں۔ دانت بٹھ گئے تھے۔ میں تالاب سے ماتھے میں پانی لائی۔ اونکے منہ پر چھینے دیئے۔ بڑی شکل سے ہوش میں آئیں۔ میں نے کہا۔ سبھل کے بیٹھے۔ خدا کے صدقے سے وہ آفت مل گئی۔ خاطر جمع رکھیے۔ اور غور توں کو بھی پانی چھڑک چھڑک کے اٹھایا۔ سب اٹھ اٹھ کے بیٹھیں۔ جب اطمینان ہو گیا۔ تو میں نے کل واٹھ بیان کیا۔ بیگم صاحب بہت ہی خوش ہوئیں۔

سرفراز خان کو بلوا بھجا۔

سرفراز۔ سرکار کچھ دیدیجئے۔ فیہ اس کے کام نہ چلے گا۔ اس وقت نامرادو جان پہنا ہوا تین تہ آفت ملانی۔

بیگم۔ کسی نہ کسی وقت کی محبت کام ہی آجاتی ہے۔

میں۔ (میں نے اس بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ اس لیے کہ میں سمجھ گئی کہ اس وقت کچھ

میں یہ راز کی بات ان کے منہ سے نکل گئی ہے۔ اس موقع پر ایسی باتوں کا اظہار انکی شان کے خلاف ہے) جی نہیں۔ میں نے کیا کیا۔ یہ بھی اتفاق تھا۔

غصہ یہ کہ بیگم صاحب نے صند و تہہ رنگایا۔ پان سو نقد اور پان پان سو کا بیونے چاندی کا زبور دے کے اور غنیمت ملا۔ سب کی جان میں جان آئی۔ بیگم کا دوست کا کہنا تھا۔ آج تک یاد ہے۔

بیگم۔ کیوں امراؤ جان باغ میں رہنے کا ارادہ نہ کیا؟

میں۔ حضور سچ کہتی تھیں۔

اب صبح کے تین بج گئے تھے ہم سب لوگ اونٹن اور گھڑے کے کوٹھی میں گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ میں بھی اونٹنی۔ کوٹھی کے رآمدے میں ایک ہلنگ میرے لیے بچھو دیا گیا۔ بند کیسے آئی ہے۔ رات بھر جاگ رہی۔ صبح ہونے سب سو رہے۔ میری آنکھ بھی لگ گئی تھی۔ ابھی نیند بھر کے سوتے نہ پانی تھی کہ بیٹ خدنگار سواری سے آگئے مجھے جگوا یا۔ میں آنکھیں ملتی ہوئی باہر گئی۔

خدنگار۔ آپ تو خوب بہان آئیں۔ رات بھر ہم لوگ راہ دیکھا کئے۔

میں۔ کیونکر آئی۔ سواری کو تو رخصت کر دیا تھا۔

خدنگار۔ اچھا تو اب چلے۔ لکھنؤ سے لوگ آپ کے پاس آئے ہیں۔

میں سمجھ گئی۔ ہوں ہوں۔ بوا حسینی اور گوہر مرزا ہوں گے۔ آخر تپا لگا لیا نہ۔

میں۔ اچھا چلتی ہوں۔ سواری لائے ہو۔ خدنگار۔ حاضر ہے۔

جب میں نے جانے کا قصد کیا دو ایک عورتیں اور جاگ چکی تھیں۔ چکوروکا۔ کہ

بیگم صاحب سے مل کے جائیے گا۔ میں نے کہا۔ سو فٹ کام ہے۔ بیگم صاحب خد آجائے

کہ سو کے اٹھنکی۔ اب اس ہی سے تو بھر آؤ گی۔

عورتیں۔ جھلا اب کیا آؤ گی؟

گھر آ کے جو دیکھتی ہوں۔ بوا حسینی اور میان گوہر مرزا بیٹھے ہوئے ہیں۔ بوا حسینی ہرے گلے سے ہٹ گئیں۔ دوڑنے لگیں۔ میں بھی دوڑنے لگی۔

بوا حسینی۔ اشد جی کیا سمت دل کر لیا تمہیں کسی کی محبت ہی نہیں۔

میں۔ بجائے خود شرمندہ تھی۔ جواب کیا دیتی۔ جھوٹ سوٹ روئے لگی۔

سمولی گھٹکوں کے بعد جو جیسنی نے اوسی دن لکھنؤ چلنے کا ارادہ کر دیا۔ میں نے لاکھ
اصرار کیا کہ ٹھہر جاؤ۔ اوفخون نے زمانا۔ زیادہ عجلت کی یہ وجہ تھی کہ سولوی صاحب بیمار
تھے۔ جو جیسنی کو دم بھر کہیں کا ٹھہرنا شاق تھا۔ ایسی ہی سیری محبت تھی جو چلی تھی
آئی تھیں۔ وہ دن کا پورے اسباب وغیرہ کے خریدنے اور مکان کے کرائے اور
نوکر چاکرون کے حساب کرنے بن تمام ہوا۔ پوری شکرم کرایہ کر لی تھی۔ ضروری اجناس
اوپر لاد لیا۔ اور فضول سامان نوکر کو دے دیا۔ دوسرے دن لکھنؤ چھوڑ گئی
پھر وہی آب و دانہ ہے۔ وہی مکان۔ وہی کمرہ۔ وہی آدمی۔

دشت جنون کی سیر میں بہلا ہوا اتحاد
زندہان میں لائے پھر مجھے اجاب گھیر کے

دیکھیے چھوٹے کہاں تک سوزش دل کا اثر
صرصر وشت کا یہ شعلہ سے بھڑکایا ہوا

نواب ملکہ کشمور کی سہ کار بن سوز غواہی کا سلسلہ اختراع سلطنت کے دماغ تک پہنچا
اسی اثنا میں شاہزادہ مرزا سکندر حشمت عرت جو نعل صاحب کے بھائیوں میں سے ایک تھے
ایم ہو گیا تھا۔ جناب عالیہ اور جرینل صاحب کلکتہ کو چلے گئے وہ ظلم منقطع ہو گیا۔
جس زمانے میں باغی فوج نے مرزا برہمچس قدر کو مسند ریاست پر بٹھایا۔ میں
لمحا قدوات اور اسو جسے بھی کہ میرا نام شاہی محلات میں اکثر کی زبان پر تھا مبارک
دینے کے لئے طلب ہوئی۔ شہر میں اک اندھیرا تھا۔ آج ایسا گھبراہٹ۔ کل وہ گرفتار
پرسون اوسکے گولی لگی۔ چاروں طرف تباہت کا سامان نظر آتا تھا۔ سید قطب الدین
نامے اک صاحب افسران فوج میں تھے۔ اوسکا تعین در دولت پر تھا۔ میرے حال پر
بہت غایت کرنے تھے۔ اسلئے اکثر وہیں رہنا پڑتا تھا۔ مجھ سے کے بے مہی وقت
یوقت طلبی ہو جاتی تھی۔

اس چند روزہ حکومت کے زمانے میں برہمچس قدر کے گیارہویں سال کی ساگرہ طلبہ
بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس جیسے میں کشمیریوں نے یہ غزل گائی تھی۔

غیرت ہنسا ہر برہمچس قدر
گو ہم نایاب ہو برہمچس قدر
دن نے ایک غزل اس موقع کے لیے تصنیف کی تھی۔ اوسکا مطلع یہ ہے۔

دل ہزاروں کے تری جھولی ادا میں لینگلی
حسرتیں چاہنے والوں کی بلالیں لینگلی

رسوا۔ امداد جان جنے مطلع قریب است ہی کا کہا ہے اور کوئی شخصہ یاد ہو تو پڑھو۔
امراؤ جان۔ گیارہ شعر کہے تھے۔ مگر آپ کے سر کی قسم ہوا اس مطلع کے اور کوئی شعر
یاد نہیں۔ وہ زمانہ اسی آفت کا تھا۔ نگہ پری دن رات جان و دھڑکے میں رہتی تھی۔
غزل ایک پرے پر لکھ لی تھی۔ جس دن تک بلکھا جب نصیر باغ سے نکلی میں وہ
پرچم میرے پاؤں میں تھا۔ پھر جب وہاں سے نکلنا ہوا ہر اول جول میں پاؤں میں گیا
جونیان اور دوڑے تک جھوٹ گئے۔

رسوا۔ بھلا کچھ یاد ہے بلک صاحب کس من نصیر باغ سے نکلی تھیں۔

امراؤ۔ دن تو یاد نہیں۔ ہزاری روزے کے دوسرے یا تیسرے دن۔

رسوا۔ ان تھیں خوب یاد۔ رجب کی اونیسویں تاریخ تھی۔ جلا نصل کون سی تھی۔

امراؤ۔ اخیر جائے تھے۔ روز کے چار باج دن باقی رہے ہوں گے۔

رسوا۔ بالکل درست۔ راج کی سولہویں تاریخ تھی۔ آجھا تو تم بلک صاحب کے ساتھ
نصیر باغ سے نکلیں۔

امراؤ جی بان۔ بوڑھی تک ہمراہ گئی۔ راستے میں نکلا امداد بزر دل افسران فوج کے
غمرے اور بلک کی خوشامد عمر بھر نہ بھولے گی۔ ایک صاحب کہتے ہیں۔ لو صاحب اپنے
راج میں ہم پیدل چلے۔ دوسرے صاحب فرماتے ہیں۔ بھلا کھائے کا تو نظام دولت
ہوتا۔ میرے صاحب، فیم کو بیٹ رہے ہیں۔ چوتھے اپنی جان لڑو رہے ہیں کہ حدوت
پر نہیں ملا۔ جب ہر ایک سے انگریزی فوج نے بوڑھی پر ہار دیا ہے اوسیں سید
قطب الدین نامے تھے۔ بلک صاحب نہال کی طرف روانہ ہوئے۔ میں اپنی جان
بچا کے بعض باہر چلی آئی۔

رسوا۔ سناسے بوڑھی میں چاروں کے لیے خوب چل پل ہو گئی تھی۔
امراؤ۔ آپ نے تو سناسے میں نے ان اکھوں سے دیکھا ہے۔ لکھنؤ کے بھاگے ہوئے

سب وہیں جمع ہو گئے تھے۔ بڑی کا بازو لگھو کا چوک معلوم ہوتا تھا۔
 رسوا۔ اچھا اس لیے سے جگہ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ کہ وہ مال جو آپ نے
 یہاں فیضو سے لیا تھا۔ اس کا کیا حشر ہوا۔
 امراؤ جان۔ (ایک آہ سرد بھر کے) اکیسویں نہ پوچھئے۔
 رسوا۔ قدریں سب لٹ گئیں۔

امراؤ۔ قدریں لٹ جانا تو اتنا افسوس تھا۔ رسوا۔ بھر کیا ہوا۔
 امراؤ۔ سارا قصہ دہرا نا پڑا۔ جس دن شب کو میں فیضو کے ساتھ بھاگنے والی تھی مینے
 کل زبور اور کٹر فیان ایک پٹاری میں بند کی۔ اوپر سے خوب کپڑا لپیٹ دیا۔
 خانم کے مکان کے پچھڑے ایک میر صاحب رہتے تھے۔ اما باڑے کے کوٹھے کی
 دیوار پر چڑھا ہوا۔ تو ان کے مکان کا سامنا ہو جاتا تھا۔ میں اکثر چار پائی لٹکا کے اس پر چڑھ
 پر چڑھایا کرتی تھی۔ اور میر صاحب کی بہن سے باتیں کیا کرتی تھی۔

وہ میر کی پٹاری میں سے اڑھائی ہین کے پاس پھینک دی۔ اور ان سے ماتھے پر
 کے ہکا کہ اس کو حفاظت سے رکھنا۔ اور تون نے فیض بادی سے آئے کے بدوہ ماری
 اسی طرح کوڑھ میں لپیٹی ہوئی سر سے حوالے کر دی۔ قدریں تمام دنیا کے گھر لے کر
 کہہ نہیں کہ لٹ گئی تو میں اودھکا کیا کر لیتی۔ مگر وہاری پوری۔ ایک جہت تک نقصان
 نہیں ہوا۔ ایسے ہی لوگوں سے زمین و آسمان ٹھہرا ہوا ہے۔ مینے نوک کی زیادت جانی
 رسوا۔ بھلا کئے کا مال ہو گا۔

امراؤ۔ البتہ کوئی دس ہندہ ہزار کا مال تھا۔

رسوا۔ ادا کیا ہوا۔
 رسوا۔ مگر لوگ تو شہور کرتے ہیں تمہارا ایک جہت بھی قدریں نہیں لٹا۔ سب مال بھار
 پاس ہے۔

امراؤ۔ اگر مال ہوتا تو ان مالوں رہتی۔ جیسے اب رہتی ہوں۔

رسوا۔ لوگ کہتے ہیں۔ نے اپنا بھل نکالا ہے۔ اگر نہیں ہے تو خیر کیاں سے کیا
 ہے۔ اب بھی کچھ بڑے مالوں نہیں رہیں۔ وہ آدمی تو کہیں خوش خوارک اور
 خوش فتناک بھی ہو۔

امراؤ۔ خدارزاں ہے۔ جو جیسا خرچ ہے وہ اس کو ضرور ملتا ہے۔ اس مال کا تو ایک جہ
 بھی نہیں رہا۔

رسوا۔ آٹھا تو بھر کیا ہوا۔

امراؤ۔ اب کیا بناؤں۔ ایک ہریان۔

رسوا۔ میں سمجھ گیا۔ یہ گوہر زرا صاحب کی حرکت ہو گی۔

امراؤ۔ میں اپنے منہ سے نہیں کہتی۔ شاید آپ کا قیاس غلط ہو۔
 رسوا۔ بیشک تمہارے عالی ظرف ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ دیکھیے وہ مین کریم
 مین اور تمہیں پوچھتے تک نہیں۔

امراؤ۔ مرزا صاحب بڑی سے رحم مارنا زنا زنا۔ اب وہ مجھے کون پوچھیں۔
 حث ہوئے کہ ترک ملاقات ہو گئی۔

رسوا۔ اب کبھی قشریت بھی لاتے ہیں۔

امراؤ۔ وہ کہا ہے کو قشریت لائیں گے۔ میں اکثر جانی ہوں۔ اونچی پوری سے محبت
 ہو گئی ہے۔ ابھی چار دن ہوئے اڑھائی کی دودھ بڑھائی کی تھی تو بھلا بھلا تھا۔

رسوا۔ جب بھی کچھ دے ہی آئی ہو گی۔

امراؤ۔ جی نہیں میں کس قابل ہوں جو کسی کو کچھ دوں گی۔

رسوا۔ تو وہ مال گوہر زرا صاحب کے کئے لگا۔

امراؤ۔ مرزا صاحب مال کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ماتھے کا بل ہے۔ فقط بات پہنچتی

ہے۔ اب بھی اپنے مینا کرنے والے کے قربان جاؤں! کبھی ننگی جھوکی نہیں رہتی۔

آپ ایسے قدر وادوں کو خدا سلامت رکھے۔ مجھے کسی بات کی تکلیف نہیں ہے۔

رسوا۔ مین کیا شک ہے۔ وہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ اب بھی سوئے اچھی

ہزار سے اچھی۔ داندایہ تمہاری نیت کا غرہ ہے۔ خدا تے زیارت سے بھی شرم کیا

امراؤ۔ جی مان مولائے سب مرادیں پوری کیں۔ اب یہ تمہارے کہ پھر مجھے کر ملا لگاؤ۔

سری منی عزیز ہو جاے۔ مرزا صاحب میں تو اس ارادے سے گئی تھی کہ پھر کے آؤں

مگر خدا جانے کیا ہوا تھا کہ لگھو سر پر وار ہو گیا۔ گرا کی اگر خدا نے جانا اور جان ہو گیا تو

پھر آؤں گی۔

سن چکے حال تباہی کا مرے اور نو
اب تھیں کچھ مری نظیر غزا دیتی ہے

بوٹری سے یکم صاحبہ اور ناز میں ندر نیال کو روانہ ہوئے۔ یہ دے طلب الدین
ژائی میں مارے جا چکے تھے۔ بن ہزار شکل فیض آباد آئی پہلے سز میں اور نری۔
بھر نری لے کے پاس ایک کمرہ کرائے کو لے لیا تھا یار نری کو کر کے لے گیا باجی نا۔
شروع کر دیا۔

فیض آباد میں رہتے ہوئے اب مجھے چھ مہینے گزر چکے ہیں۔ وہاں کی آب و ہوا
طبیعت کے بہت موافق ہے۔ دل لگا ہوا ہے۔ آٹھویں دسویں کوئی نہ کوئی خبر
آ جاتا ہے۔ ادھی برس ہے۔ تمام شہر میں میرے گلے کی دھوم ہے۔ جہاں بھر ہوتا
ہے ہزاروں آدمی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میرے کمرے کے نیچے لوگ قریبین کرتے ہوئے
نکلتے ہیں۔ میں دن میں خوش ہوتی ہوں۔ کبھی کبھی خواب و خیال کی طرح بچپن کی
باتیں بھی یاد آ جاتی ہیں۔ اور اسکے ساتھ ہی دل میں اک جوش بسا پیدا ہوتا ہے
مگر اکثر اے سلطنت۔ غدر بر جس قدری۔ یہ بسا سائے آنکھوں کے سائے گزر چکے
ہیں۔ کلیجہا چھڑکا ہو گیا ہے۔ مان باپ کے قصور کے ساتھ ہی یہ خیال آتا ہے۔
خدا جانے اب کوئی ذمہ بھی ہو یا نہ ہو۔ اور اگر ہو تو اب اوکو مجھے کیا مطلب۔ وہ
اور عالم میں ہوں گے۔ میں اور عالم میں ہوں۔ خون کا جوش سہی سگر کوئی خبر ندر
آدمی مجھے لٹا کو ارا کرے گا۔ اب اون سے ملنے کی کوشش کرنا اوکو سچ دینا ہے۔
مگر کا خیال آتے ہی یہ باتیں دل میں آتی تھیں۔ پھر طبیعت اور طرف متوجہ نہ
ہو جاتی تھی۔

گھنٹی کی یاد اکثر تاتی تھی۔ مگر جب انقلاب کا خیال آتا تھا۔ دل بھر جاتا تھا۔
اب وہاں کون ہے جس کے لئے جاؤں۔ خانم جیتی ہیں تو کیا ہوا۔ اون سے
اب کو تو کہنے گی۔ وہ دہی اگلی حکومت جانیگی۔ مجھے اب اونکی قید میں رہنا
کسی طرح منظور نہ تھا۔ جو مال میر صاحب کی بہن کے پاس امانت تھا۔ وہ اب کیا
لے گا۔ تمام لکھنؤ لٹ گیا۔ میر صاحب کا گھوڑی لٹ گیا ہوگا۔ اوکا
اب خیال ہی بیکار ہے۔ اور اگر نہیں مارتا بھی اوکی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرے

اتھ گئے جو کچھ موجود ہے وہ کیا کرے۔

ایک دن کمرے پر بھی ہوئی ہوں۔ ایک صاحب شریفانہ صورت اور جسے شریف
لائے۔ میں نے پاؤں بنا کے دیا۔ تھو بھر دایا۔ حالات دریافت کرنے سے معلوم ہوا۔
ہو گیا صاحب کے عزیزوں سے ہیں۔ وثیقہ پاتے ہیں۔ میں نے باقون باتوں میں انقبو
کی روشنی کی آئینہ اوٹھا کے پڑائے ملازمن کا ذکر چھپا۔
میں۔ اگلے نوکروں میں اب کون کون رہ گیا ہے۔

خواب صاحب۔ اکثر مر گئے نئے نئے نوکر ہیں۔ اب وہ کا خانہ ہی نہیں رہا بالکل
نیا انتظام ہے۔

میں۔ اگلے نوکروں میں ایک بدصورت مجھدار تھے۔

خواب۔ مان تھے۔ تم اوٹھیں کیا جانا۔

میں۔ غدر سے پہلے میں ایک رتبہ عزم میں فیض آباد آئی تھی۔ قبر سے پر روشنی رکھنے
گئی تھی۔ اور غنوں نے میری بڑی خاطر کی تھی۔

خواب۔ وہی مجھدار آنا۔ جنگی ایک لڑکی نکل گئی تھی۔

میں۔ یہ مجھے کیا معلوم (دل میں) اٹائے انسانہ تک شہور ہے۔

خواب۔ تو تو کبھی مجھدار تھے۔ اور اب بھی ہیں۔ مگر روشنی وغیرہ کا انتظام غدر سے
پہلے ہی کرتے تھے۔

میں۔ ایک لڑکا بھی اوکا تھا۔

خواب۔ تھے لڑکے کو کہاں دیکھا۔

میں۔ اوٹھن اون کے ساتھ تھا۔ ایسی کل بھی ملے کم دیکھی ہے۔ بن کہے میں
بہان گئی تھی۔

خواب۔ مجھدار غدر سے پہلے ہی مر گئے۔ وہی لڑکا اونکی جگہ نوکر ہے۔

ایکے بعد بات کے ٹالنے کے لیے میں نے اور کچھ حالات ادھر ادھر کے بوجھے
نرا صاحب نے سوز پڑنے کی فرمائش کی۔ میں نے دوسرے شائے بہت مظلومانہ
بات کچھ زیادہ آگئی تھی کھر قشر میں لے گئے۔

باپ کے مرنے کا حال سنکے مجھے بہت ہی رنج ہوا۔ اب ان رات بھر رویا کی دھج

دن ہے اختیار جی ہاں بھائی کر جا کے دیکھا دن۔ دو دن کے بعد ایک ہجر آگیا لگی
تیار کی کہنے لگی۔ یہاں کا ہجر آیا تھا۔ دمان گئی۔ نئے کانام یا دہنہن۔ مکان کے
پاس بہت بڑا بڑا اعلیٰ کا درخت تھا۔ اوسے کے نیچے لنگرہ مانا گیا تھا۔ گردن تان
نہیں۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ مگر لوگ کچھ ایسے ہی ویسے تھے۔ قاتلون کے ہجے
اور سلسلے کچھ یوں بن عزت بن نہیں۔ پہلا ہجر اکوئی نو بجے شروع ہوا۔ بارہ بجے
تک رہا۔ اس مقام کو دیکھ کے مجھے وحشت سی ہوتی تھی۔ دل اٹھا چلا آتا تھا
یہی جی میں آتا تھا کہ یہاں میرا مکان ہے۔ یہ اعلیٰ کا درخت وہی ہے۔ جسکے نیچے
میں کھیل کرتی تھی۔ جو لوگ نخل میں خربک تھے اونہیں سے بعض آدمی ایسے معلوم
ہوتے تھے جیسے میں نے انکو کہاں دیکھا ہے۔ شبہ مٹانے کے لئے میں قاتلون
باہر نکلی۔ گھروں کی قطع کچھ اور ہو گئی تھی۔ اس سے خیال ہوا۔ شاید یہ وہ جگہ ہو۔
ایک مکان کے دروازے کو غور سے دیکھا کی۔ دل کو یقین ہو گیا تھا کہ یہی میرا مکان
جی جانتا ہے مکان میں کھسی علی جاؤں۔ مان کے قدموں پر گر پڑوں۔ وہ کھلے گا
مگر جرات نہ ہوتی تھی۔ ایسے کہ میں جانتی ہوں دمانت میں رند یوں سے بہت
ہی پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرے باپ بھائی کی عزت کا خیال تھا۔ ذرا صاحب کی لون
سے معلوم ہو چکا تھا کہ جمدار کی لڑکی کا بچلانا کو کون کو معلوم ہے۔ پھر جی کہتا تھا
کیا غضب ہے۔ صحت ایک دیوار کی آڑ ہے۔ اوھر میری امان بھی ہو گئی۔ اور میں
یہاں اوسکے لئے ٹرپ رہی ہوں۔ ارک نظر صورت دیکھنا بھی ممکن نہیں۔ کیا مجبوری
ہے۔ اسی اور حیرت بن تھی کہ ایک عورت نے اس کے پوچھا۔ "تھیں لکھو سے
آئی ہو۔"

میں۔ مان۔ اب تو میرا کلیہ ہاتھوں اور جھانے لگا۔

عورت۔ آجھا تو ذرا دھڑکی آج۔ تمہیں کوئی بلاتا ہے۔
میں۔ "آجھا" یہ کہہ کے اوسکے ساتھ چلی۔ ایک ایک پاؤں گویا سوسن کا
ہو گیا تھا۔ قدم رکھتی کہیں تھی پڑتا کہیں تھا۔

وہ عورت اس مکان کے دروازے پر جھکے گئی جسے میں اپنا مکان سمجھتی رہی
تھی۔ اس مکان کی ڈیڑھ میں ایک چار پائی پر جھک جھکا دیا۔ اگلے کے دروازے

ٹاٹ کا پردہ بڑا ہوا تھا۔ اوسکے پیچھے دو تین عورتیں اس کے کھڑی ہوئیں۔
ایک۔ لکھو سے تمہیں آئی ہو۔ میں۔ جی مان۔
دوسری۔ تمہارا نام کیا ہے۔

میں۔ (جی میں تو آیا کہہ دوں میرن مگر پھر دل کو تمام کے) افراد جان۔
پہلی۔ تمہارا وطن خاص لکھو ہے۔

میں۔ (اب مجھے ضبط ہو سکا۔ اسنوں کل پڑے۔ اصلی وطن تو یہی ہے جہاں کھڑی
پہلی ہو تو کیا بھلے کی رہنے والی ہو؟)

میں۔ (آنکھوں سے آنسو بار بار جاری تھے) بھل جوا ب (دیا) جی مان۔
دوسری۔ کیا تم ذات کی پتہ پتا ہو؟

میں۔ ذات کی پتہ پتا تو نہیں ہوں۔ تقدیر کا کھلا ہوا کرتی ہوں۔

پہلی۔ (غور دے) آجھا تو دنی کیوں ہو۔ آخر کب پھر تم کون ہو؟

میں۔ (آنسو پونچھ کے) کیا بتاؤں کون ہوں۔ کچھ کہتے بن نہیں پڑتا۔

آجی بائیں میں نے بہت دل کو بسف حال کے کی نہیں۔ اب با نخل تاب ضبط تھی
سینے میں دم رکھنے لگا تھا۔

اسنے میں دو عورتیں بر دے کے باہر نکلیں۔ ایک کے ہاتھ میں چراغ تھا۔ اسنے
میرے منہ کو اٹھ سے تھا کہ کان کی ٹونکے پاس غور سے دیکھا۔ اور یہ کہہ کے دوسرے
کو دکھایا۔ اور کہا۔ "کون ہم نہ کہتے تھے۔ وہی ہے۔"

دوسری۔ "مانے میری میرن" کہہ کے لپٹ گئی۔ دونوں مان بیٹیاں چہین مار مار
کے روتے لگیں۔ پچکیاں بندھ گئیں۔ آخر دو عورتوں نے اس کے پھڑپھڑایا۔ اسکے بعد
میں نے اپنا سارا قصہ دہرایا۔ میری مان میٹھی سننا کی اور رویا کی۔ بانی رات ہم
دو دن وہیں بیٹھے رہے۔ صبح ہوتے میں رخصت ہوئی۔ مان نے چلتے وقت جس حیرت
بھری نگاہ سے جھک دیکھا تھا وہ نگاہ میرے دم تک مجھے دھولے گی۔ مگر مجبوری۔

دو روز و شان نہ ہونے پایا تھا کہ میں سوار ہو کے اپنے کمرے پر چلی آئی۔ دوسرے صبح
کو نہ۔ مگر میں نے گھر پر کے کل اوپر پھر کے کا داپس دیا۔ اور بیماری کا بیان کہنا
دو لہا کے باپ نے آدھا اوپر پھر دیا۔ اسدن دن بھر میرا جو حال رہا۔ خدا ہی پر

خوب روشن ہے۔ کمرے کے دروازے بند کر کے دن بھر بنگ پر پڑی رویا کی۔
دوسرے دن شام کو کوئی دو گھنٹی رات گئے ایک جوان سا آدمی سا فنی گھر
کوئی مین بائیں برس کی عمر بڑی باندھے۔ پائون کی ایسی دردی پہنے
بیرے کمرے پر آیا۔ مین نے حقہ بھر دیا۔ پاننان مین پان نہ تھے۔ اما کو ہلاکے بچکے
سے کہا۔ پان نے آؤ۔ اتفاق سے اور کوئی بھی اوس وقت نہ تھا۔ کمرے مین مین ہوں
اور وہ ہے۔

جوان کل تھین بھرے کو لگی تھین۔ یہ اس طور سے کہا تھا کہ مین چمک گئی۔
مین۔ مان۔ اتنا کہہ کے اوسکے چہرے کی طرف جو دیکھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے
آنکھوں سے خون نچک رہا ہے۔

جوان۔ (سرخ پا کر کے) خوب گھرانے کا نام روشن کیا۔

مین (اب سمجھ کر یہ کون شخص ہے) اسکو تو خدا ہی جانتا ہے۔

جوان۔ ہم تو سمجھے تھے تم گرگین۔ مگر تم اتناک زندہ ہو۔

مین۔ بے غیرت زندگی تھی نہ مری۔ خدا کہیں جلد موت دے۔

جوان۔ بیشک اس زندگی سے موت لاکھ درجہ بہتر تھی۔ تھین تو چلو پھر پانی پین
ڈوب مرنا تھا۔ یا کچھ کھا کے سو رہی ہو مین۔

مین۔ خود اتنی کچھ نہ تھی۔ اور نہ آج تک کسی نے یہ نیک صلاح دی۔ اب یہی۔

جوان۔ اگر ایسی ہی غیرت ہوتی تو اس شہر مین کبھی نہ آتیں۔ اور اب بھی تھین

تو تھین اس محلے مین بھرے کو جانا تھا۔ جہاں کی رہنے والی تھین۔

مین۔ مان اتنی غطا ضرور ہوئی۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا۔

جوان۔ آجھا۔ اب تو معلوم ہو گیا۔ مین۔ اب کیا ہوتا ہے۔

جوان۔ (بہت ہی حقہ ہو کے) اب کیا ہوتا ہے! اب کیا ہوتا ہے۔ اب یہ

(چھری کمرے نکال کے پھر چھینا دو تو نمانقہ باز کے گلے پر چھری رکھ دی)

ہونا ہے۔

اتنے مین اما بازار سے پان لے کے آئی۔ اسنے جو یہ حال دیکھا۔ لگی چیخنے۔
ارٹے اور ڈوڑ۔ جوی کو کوئی مارے ڈالتا ہے۔

جوان۔ (چھری گلے سے ہٹا کے ہاتھ چھوڑ دیے) عورت کو کیا ماروں۔ اور عورت بھی
کون۔ بڑی۔ . . .

اتنا کہہ کے اور مین مارا کے رونے لگا۔

مین۔ پہلے ہی سے ادبی تھی۔ جب اسنے گلے پر چھری رکھی تھی۔ جان کو فون ہو ایک
دھچکا سا ٹکلیے پر پہنچا تھا۔ اس سے دم بخود سی ہو گئی تھی۔ جب وہ چھوڑ کر رنے لگا مین بھی
رونے لگی۔

امانے دو ایک چمین ماری تھین۔ جب اسنے یہ حال دیکھا۔ کچھ چپ سی ہو رہی۔

اور مین نے اشارے سے منع کیا۔ ایک کنارے کھڑی ہو گئی۔

جب دو دن خوب رو دھوپکے۔

جوان۔ (ہاتھ جوڑ کے) "آجما ڈاس شہر سے کہیں چلے جاؤ۔"

مین۔ کل بجلی جاؤ گئی۔ مگر ایک مرتبہ مان کو اور دیکھ لیتی۔

جوان۔ بس اب دل سے ڈور رکھو۔ صاف کرو۔ کل آمان نے تھین گھر پر بلا لیا۔

مین نہ ہوا۔ نہیں تو اسی وقت دارا نارا ہو جانا۔ محلے بھر مین چرے ہو رہے ہیں۔

مین۔ سننے دیکھ لیا۔ جان سے نوین ڈرتی تھین۔ مگر مانے تمہاری جان کا خیال ہے۔

تم اپنے بچوں کے سر پر سلامت رہو۔ خیر اگر جینے رہے تو کبھی نہ کبھی خیر دعا فست سن جا
لیا کریں گے۔

جوان۔ براے خدا کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا۔

مین۔ آجھا۔

وہ جوان خوادھ کے چلا گیا۔ مین اپنے غم مین مبتلا تھی۔ امانے اور جان کھانا کھانے کی

اما۔ یہ کون تھے۔ ا۔

مین۔ زندگی کے مکان پر ہزار آدمی آتے ہیں۔ کوئی تھے۔ تھین کیا۔ بہر طور اما کو لیا

رات کی رات سو رہی۔ صبح کو اڈھ کے لکھنؤ چلنے کی تیاری کی۔ خاموش شام شکر م

کراہ کر کے روانہ ہو گئی۔

لکھنؤ میں آکر خانم کے مکان پر ادتری۔ وہ جو کہ۔ وہی کلا۔ وہی ہم ہیں۔ اسنے آنے والے

سے کچھ لوگ کلکتہ چلے گئے تھے۔ کچھ اور شہر ون میں کل گئے تھے۔ شہر ون یا انتظام
نے تعاون جاری تھے۔ آصف الدولہ کے اہم ہاؤس میں قلعہ تھا۔ چارون طرف
دھس بنے ہوئے تھے۔ گول دروازے سے لیکر دریا اور دروازے کھانات کھدے
ہوئے ہوئے تھے۔ باجی چوڑی چوڑی کھنکھنیں۔ لیکن میں کھربے بنا
جاتے تھے۔ نامے نالیان صاف کجانی تھیں۔ غرض کہ لکھنؤ اور سی کچھ ہو گیا تھا۔
میں دو چار بیسے خانے کے مکان پر رہی۔ اس کے بعد برطانیہ ایک علیحدہ
کمرہ لیکر رہنا شروع کیا۔ رہائے کے انقلاب کے ساتھ خانہ کی طبیعت بھی کچھ بدل گئی
تھی۔ فراج میں ایک قسم کی بے پروائی سی ہو گئی تھی۔ جو ریڈیان کل کے علیحدہ کچا
تھیں۔ اوکا نو ذکر کیا۔ جو ساتھ رہتی تھیں اون کے روپے پیسے سے کوئی واسطہ
غرض نہ تھی۔ میرا علیحدہ ہو جانا بھی کچھ اون کے فراج کے خلاف نہ گذرا۔ دوسرے
نہرے میں جاتی تھی۔ سلام کر کے چلی آتی تھی۔ اسی زمانے میں نواب محمد علی گھا
سے مجھے تپاک بڑھا پہلے کچھ دنوں تشریف لایا کیے۔ پھر فرار کیا۔ اس کے بعد مجھے
پابند کرنا چاہا۔ جلا جیسے کب ہو سکتا تھا کہ لکھنؤ میں رہوں اور اپنے قدیم ملنے والوں سے
خفاات ترک کروں۔ جب میں نے نواب صاحب کی طبیعت کا یہ رنگ دیکھا۔ ترک
تسلیم کرنا چاہا۔ نواب صاحب نے عدالت میں دعویٰ کر دیا کہ ”مجھے نکاح ہے۔“ عجب
آفت میں جان بھنسی۔ مقدمہ کی پیردی میں ہزاروں روپے صرف ہوئے۔ عدالت
ابتدائی میں فیصلہ نواب صاحب کے موافق ہوا۔ اب مجھے روپوں پر ہاتھ نہ توں بھیجی
پہری۔ دلیل کی معرفت اپیل کی۔ اپیل میں نواب صاحب ہارے۔ نواب صاحب نے
عدالت عالیہ میں اپیل کی۔ یہاں بھی ہارے۔ اب ناجائز و حکیمانہ دبا شروع کیڑ
”مارڈ اون گگا“ ”ناک کاسٹ لون گگا“ اس زمانے میں جگو جان کی حفاظت کے
بائے دس بارہ آدمی ٹھہر کر رکھنا پڑے جہاں جاتی ہوں۔ آدمی فینس کے ساتھ
ساتھ ہیں۔ ناک میں دم ہو گیا۔ آخر میں نے فوجداری میں چلنے کا دعویٰ کیا۔
گواہوں سے ثابت کر دیا کہ بیشک نواب صاحب روپے آزار ہیں۔ حاکم نے نواب صاحب
سے چلنے لیا۔ اب باس کے جان بھولی۔ چھ برس تک ان قدموں میں پھنسی رہی۔
خدا خدا کر کے نجات ہوئی۔

جس زمانے میں نواب سے مقدمہ لڑا تھا۔ ایک صاحب اکبر علی خان نامے۔ غنارہ پٹے۔
چلنے پرزے۔ آفت کے پرکالے۔ ناجائز کارروائیوں میں مشاق۔ جلساری میں
ادشاد۔ جھوٹے مقدمے بنانے میں وجہ عصر۔ عدالت کو دھوکا دینے میں بھارتیہ
میری طرف سے پروکار تھے۔ اونکی وجہ سے عدالتی کاموں میں بہت مدد ملی۔ جن قویہ
سے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو میں نواب سے سر نہ ہوتی۔ اگرچہ سچا واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب
سے مجھے بکھل نہ تھا۔ مگر عدالتوں میں اکثر بھی بات کے لیے بھی جھوٹے گواہ پیش کرنا
ہوتے ہیں۔ فراج ثانی کی طرف سے بالکل جھوٹا دعویٰ تھا۔ لیکن مقدمہ اس سلیطے سے
بنایا گیا تھا کہ کوئی صورت تفریق نہ تھی۔ بکھل کے ثبوت میں دو مولوی پیش کیے گئے
تھے جن کے ماتھوں پر گھٹے پڑے ہوئے۔ بڑے بڑے عمامے سر پر۔ عجائز زیب پوش
ماتھوں میں کھٹے۔ پادشاه میں کھٹیں۔ بات بات میں قال اللہ وقال الرسول پہنکی
صورت دیکھ کے حاکم عدالت کیا کسی نیک نیت آدمی کو کذب و دروغ کا شبہ بھی
ہو سکتا۔ انہیں سے ایک بزرگ ناکح کے وکیل بنے تھے۔ اور ایک منگودہ کے۔
مگر پھر حق سے اور ناحق ناحق۔ جرح میں بگڑ گئے۔ نواب کے اور گواہ ان سے
زیادہ بگڑے۔ اور انہیں گواہوں کی گواہی کی وجہ سے نواب اپیل مار گئے۔ فوجداری
میں میری طرف سے جو گواہ پیش کیے گئے تھے وہ سب اکبر علی کے بنائے ہوئے تھے
بالکل نہ بگڑے۔

اکبر علی خان کی آمد و رفت میرے مکان پر بہت زمانے تک رہی۔ اونہوں نے بہت سا
پورا حق دوستی کا ادا کیا۔ ایک جہہ نہیں لیا۔ بلکہ اپنے پاس سے بہت کچھ صرف کیا۔ وہ
اونکو میرے ساتھ ایک قسم کی محبت تھی۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ بڑے آدمی بھی بالکل بڑے
ہنرمند ہوتے۔ کسی کسی سے بھلا ضرور ہو جاتے ہیں۔ اگلے زمانے کے چوروں کی نسبت
آپ نے سنا ہوگا کہ جب کسی سے دوستی کر لیتے تھے تو اس کا پورا نباہ کرتے تھے۔ بغیر کسی قدر
بھلائی کے زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ جو شخص سب سے برا ہو وہ لکھا ہو کہ رہے گا جب تک کو
سے مقدمہ نہ ہو۔ میں کسی اجنبی شخص کو اپنے پاس آنے نہ دیتی تھی۔ سارا دار کا بھجوا ہوا
خفیہ خبر لینے آیا ہو۔ یا اور کسی طرح کا نقصان پہنچائے۔ اکبر علی خان ایک مرتبہ صبح کو کچری
جانے وقت اور پھر شام کو کچری سے پلٹ کے میرے مکان پر گئے تھے۔ شام کو بہن ناز

پڑھی تھی۔ مگر سوکھا آٹا تھا ہر چند اپنے امر ار کیا کہ مکان سے کھانا نکالو کی کیا ضرورت۔ مگر
 اوھوں نے دانا مار خیر ہو کر کے چپ ہو رہی۔ میرے گھر کے کھانے سے انکار بھی نہ تھا۔
 میں بھی اودھن کے ساتھ کھانا کھاتی تھی۔ اس زمانہ میں بھی نماز کی پابند ہو جاتی تھی۔
 اکبر علیخان کو قنبر داری سے عیش تھا۔ رمضان اور محرم میں وہ اس قدر تکب کا م
 کرنے لگے جس سے اون کے سال بھر کے گناہوں کی تلافی ہو جاتی تھی۔ یہ صحیح ہو یا غلط
 مگر اذکار افغا دی ہی تھا۔

رسوا۔ یہ معاملہ ایمان کا ہے اسلئے انسان مجھے کہہ لینے دیجئے کہ یہ افغا و صبح نہیں ہے۔
 امراؤ۔ میرے نزدیک بھی ایسا ہی ہے۔

رسوا۔ عقل مندوں نے گناہوں کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک وہ جسکا انفرادی ہی ذات
 تک رہتا ہے۔ اور دوسرے وہ جسکا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے۔ میری رائے ناقص
 میں پہلی قسم کے گناہ معذہ اور دوسری قسم کے کبیرہ ہیں۔ اگرچہ اور لوگوں کی رائے
 ایکے خلاف ہو۔ جن گناہوں کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے اونکی بخشش ہی لوگ
 کر سکتے ہیں۔ جنبر اور سکا بڑا اثر پہنچتا ہو۔ تھے خواجہ حافظ کا وہ شعر سنا ہو گا۔

تھے غور و مصحف بسوز آتش اند کہبہ زن

ساکن بخانہ باشش مردم آزاری کن

امراؤ جان باد کو۔ مردم آزاری بہت ہی بڑی چیز ہے۔ اسکی بخشش کہیں نہیں ہے اور
 اگر اسکی بخشش ہو۔ تو مہا ذلہ۔ خدا کی فدا کی بیکار ہے۔

امراؤ۔ بیان ہر توبال بال گنہگار ہے۔ مگر اس سے میں بھی کابنی ہوں۔

رسوا۔ مگر تھے دل آزاری بہت کی ہو گی۔

امراؤ۔ پھر یہ تو ہمارا پیشہ ہے۔ اسی دل آزاری کی بدولت لاکھوں روپے بے کلمے
 ہزاروں اڑا رہے۔

رسوا۔ پھر اسکی کیا سزا ہو گی۔

امراؤ۔ اسکی کوئی سزا نہ ہونا چاہیے۔ جسے جس قسم کی دل آزاری کی اذہمیں ایک طرح
 کی لذت ہے۔ جو اس دل آزاری کا مادہ دھن ہو جاتا ہے۔

رسوا۔ کیا خوب۔

امراؤ۔ فرض کیجئے۔ ایک صاحب نے ہکویلے نمائے میں کہیں دیکھ لیا۔ مرنے لگے۔ کوڑی
 پاس نہیں ہم بے لیل نہیں سکتے۔ اذکار دل دکھتا ہے۔ پھر اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔
 دوسرے صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ دو ہیہ بھی دیتے ہیں۔ ہم ایک اور شخص کے پابند
 ہیں۔ یا اون سے ملنا نہیں چاہتے۔ انا دل۔ اونکی جان پر جی ہے۔ پھر ہمارا کیا
 بعض صاحب ہمارے پاس اس طرح کے آتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں چاہو۔ ہم نہیں
 چاہتے۔ امارہ ہے۔ اس سے اون کو صدمہ ہو چکا ہے۔ پھر ہمارا کیا بوسہ ہے۔
 رسوا۔ برب گولی مارنے کے لائق ہیں۔ مگر بے خدا کہیں مجھے انہیں سے کسی میں نہ
 شمار کر لیجئے گا۔

امراؤ۔ فدا کرے۔ آپ خوش ہاشون میں ہیں۔ نہ آپ کسی کو چاہتے ہیں۔ نہ کوئی آپکو
 چاہتا ہے۔ اور پھر آپ سب کو چاہتے ہیں اور سب آپ کو۔

رسوا۔ یہ کیا کہا؟ ایک بات ہے۔ اور نہیں جی ہے۔ کہیں ایسا ہو سکتا ہے۔

امراؤ۔ میں نظن تو زیادہ برحق نہیں۔ مگر ہو سکتا ہے۔ جب ایک بات کے دو پیرے
 ہوں۔ ایک چاہتا غلطی کے ساتھ ہوتا ہے اور ایک برحقونی کے ساتھ۔

رسوا۔ اسکی مثال۔

امراؤ۔ پہلے کی مثال۔ جیسے آپ مجھ کو چاہتے ہیں۔ میں آپ کو۔

رسوا۔ خیر میرے ہاتھ کا مال تو میرا ہی دل جانتا ہے۔ اور آپ کے ہاتھ کا مال آپ
 کے اقرار سے معلوم ہو گیا۔ اس کے چلیے۔ دوسری مثال۔

امراؤ۔ خبر اگر نہیں چاہتے تو میرا بڑا چاہتے ہوں گے۔ دوسرے کی مثال شیئے۔ جیسے
 فریاد رس ابھی۔

رسوا۔ نہیں اس مثال میں آپ نے غلطی کی۔ اور کوئی مثال دیجئے۔

امراؤ۔ آجکل جیسے نہیں لیلی کو چاہتا تھا۔

رسوا۔ آپ بھی کیا دنیاوی مثال ڈھونڈھ کے لائی ہیں۔

امراؤ۔ آجکل جیسے۔۔۔ نظیر۔

رسوا۔ (بات کاٹ کے) اس مثال سے معاف کیجئے۔ اس موقع پر مجھ کو ایک شاعر
 آیا ہے۔ جس نے لکھا۔ اور پناہ دھن دوہرائے۔

کیا کہوں تجھے جیت وہ بلا ہے ہم
ہم کو عزت نہ ہوئی غیر کے رجانے سے

امراؤ۔ بان وہ کلکتہ والا صاحب ہے۔

رسوا۔ اتنی دور کہاں نہیں۔ کیا لکھنؤ میں ایسے نہیں رہتے۔

امراؤ۔ دنیا خالی نہیں ہے۔

رسوا۔ ان میں نے سنا تھا۔ اب اکبر علیخان کے گھر بیٹھ گئی تھیں۔

امراؤ۔ مجھے کہتے ہیں جس زمانے میں ذواب عدالت ابتدائی سے جیت گئے ہیں۔ اور میں

دوبوش ہوئی ہوں۔ اس زمانے میں اکبر علیخان مجھے اپنے مکان پر لے گئے تھے کبھی اس

رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں میں آدمی اس دھوکے میں تھے کہ میں اکبر علی کے گھر

بیٹھ گئی۔ ایک نوکری علی۔ دوسرے ادنیٰ بوی۔ تیسرے... کا نام نہ بتاؤں گی۔

رسوا۔ میں بتا دوں؟

رسوا۔ جی نہیں۔

رسوا۔ آپ بنا بیٹے۔

رسوا۔ فقرہ کیا۔ میں بھی ایک پرچہ پر لکھ کے دینا ہوں۔ پھر آپ بنا بیٹے۔

امراؤ۔ بہت ہے۔

امراؤ۔ تیسرے میں خود۔

امراؤ۔ واہ مرزا صاحب خوب پہچانا۔

رسوا۔ آپ کی عنایت ہے۔ بان تو کیا گذری؟

امراؤ۔ گذری کیا کہیں؟

اول تو مجھے ادھون نے ایک چھوٹے سے مکان میں لیوا کے اور نامہ اور ان کے مکان

سے بلا ہوا تھا۔ کھڑکی درمیان تھی۔ نوکرا کا مکان۔ ایک چھوٹی سی دلینہ۔ آگے چھتر۔

ایک اور چھتر سلنے لگا ہوا۔ اوسمیں دو چھتر لٹے بنے ہوئے۔ یہ کیا ہے باور چنانہ۔ اور ب

خانہ کی کسی ہی کچھ لیجئے۔ اسی مکان میں میں بھی رہوں۔ میان کے بے تکلف دوست

بھی آیا جائیں۔ ان میں سے ایک صاحب رئیس موضع شیخ افضل حسین چھوٹے ہی

بھائی "کہنے لگے۔ ان کے بے تکلفی نے ناک میں دم کر دیا۔ ہاؤن کی فرمائش سے

جنگ ہو گئی۔ ہر سٹے۔ بھوجی۔ بان نہ کھلاو گی۔

ایک دن دونوں۔ آخر وقت کہاں تک۔ انہما کہ پاندان میں نے اون کے آگے سر دیا۔

اور سدن سے میں خود دست بردار ہو گئی۔ اور وہ من نے قبضہ کر لیا۔ جیسے کوئی ال مردانی

پر قبضہ کرنا ہو۔ بان اس بدقصدی سے کھانے لگے کہ دیکھنے والوں کو خواہ مخواہ غرت ہو جائے۔

کھتے جوئے کی کلہریوں میں اور گلیاں پڑ رہی ہیں۔ زبان سے چاٹ رہے ہیں۔ میں نے

جب یہ غرہ دیکھا۔ چکنی کے چوسے اور لالچی رہ کر گئے۔ اس میں بھی وہ ساجھا کھانے لگے

ایک اور صاحب اور عدلی نامے اکثر حضور کھانے کے وقت خود درخشاں ہوتے تھے۔

اب یاد نہیں اکبر علیخان کے برادر بنی تھے۔ ادنی کے زمان میں بخش حد اعتدال سے

زیادہ تھا۔

ان دونوں صاحبوں کے سوا اکبر علیخان صاحب کے بے تکلف احباب بہت سے تھے۔

جن میں سے اکثر کو مقدمہ باری کا خون غلا۔ دن رات قانون چٹکارنا غلا مگر جب مرزا صاحب

تشریف لیوانے تھے نوک درلا میں ہو جاتی تھی۔ اس لیے کہ ان کو مقدموں کی باتیں سننے

سے نفرت تھی۔

اس مکان سے چند روز کے بعد میری طبیعت مد سے زیادہ اونگ گئی۔ قریب تھا کہ کہیں اور

رہنے کا بندوبست کیا جائے کہ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ اکبر علیخان کسی مقدمے میں فیصلہ آباد

گئے۔ افضل علی اپنے گاؤں۔ اتفاق سے مکان میں کوئی نہیں ہے۔ دروازے کی کڑی

بند کر لی ہے۔ میں اکیلی بیٹھی ہوں کہ اتنے میں کھڑکی (جو زمانہ مکان کے دروازے میں تھی) کھلی

اور اکبر علیخان کی بوی اندر علی آئیں۔ مجھے خواہی غواہی سلام کرنا پڑا۔ اچھا ٹی میں

خون کا چوکا بچھا تھا۔ اسی کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ پہلے بڑی دیر تک چپکے کھڑی

رہی۔ آخر میں نے کہا۔ بااخذ بیٹھ جائیے۔ بارے مجھے کہیں۔

میں۔ یہ ہم غریبوں پر کیا عنایت تھی۔ آج اور کہاں تشریف آئی۔

بوی۔ نگو میرا ناگوار ہو۔ تو علی جاؤں۔

میں۔ جی نہیں۔ آپ کا گھر ہے۔ مجھے ایسا حکم تو مناسب بھی ہے۔

بوی۔ بے باؤں نہ بناؤ۔ اگر میرا گھر ہے تو تمہارا گھر بھی ہے۔ اور کچھ چھوٹے میرا ہے نہ تمہارا۔

مگر تو کھر دالے کا ہے۔

مین۔ جی نہیں۔ خدا کے آپ کے گھر دارے ادکا بھی ہے۔ آپ کا بھی۔

بیوی۔ تم آگلی بھی رہتی ہو۔ آخر ہم بھی آدمی ہیں۔ اور دھرم کون نہیں ملی آئین۔ مان
سیان کا حکم نہوگا۔

مین۔ میان کے حکم کی توین کچھ ایسی تاج نہیں ہوں۔ مان آپ کی اجادت کی ضرورت
تھی وہ عامل ہو گئی۔ اب حاضر ہو گئی۔

بیوی۔ آچھا اڑ چلو۔ مین۔ چلیے۔

کان مین جا کے جو دیکھتی ہوں۔ خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ مانے کے منکے۔ دیگ۔ گلے۔
پتیلیان۔ لے۔ نوڑی کے پتنگ۔ سہری۔ نختون کے جو کے۔ فرش فروش۔ مگر کسی آت

کا قرینہ نہیں۔ اگنائی مین جا بجا کڑا پڑا ہوا۔ بار چننا مین سامنے ہوا میرن کھانا پکھا
ہیں۔ کھانا مین کر رہی ہیں۔ نختون کے جو کے پر پیک کے چکے ٹپے ہوئے۔ بیوی
کے پتنگ پر منون کوڑا۔ اما من نے پانڈان بیوی کے سامنے لائے رکھ دیا۔ کتے جو دن
کے دھتور مین سارا پانڈان چھپا ہوا تھا۔ دیکھ کے میرا قوجی الفش کرنے لگا۔

بیوی نے مان لگا کے دیا۔ مین نے پتنگی مین دایا۔ باتین کرنے لگی۔ اسی انا مین محلے
کی بڑھیا آ نکلی۔ زمین پر پھٹکرا مار کے بچھو گئی۔ بیوی سے (میری طرف اشارہ کر کے چھا)
بڑھیا۔ یوں کون ہیں۔ بیوی۔ اب تمہیں کیا بتاؤں؟

مین۔ پتنگی بیٹھی رہی۔ بڑھیا۔ (اکبر علیخان کی بیوی سے)

بڑھیا۔ اُدھی ایسے مین جانتی نہیں۔

مین۔ بڑی بی پھر جانتی ہو۔ نواد سکا بو چھنا کیا۔

بڑھیا۔ اُدھی بی مین تم سے نہیں بات کرتی۔ مین تو اپنی ہو صاحب سے چھتی ہوں
میرا منہ جسے بات کرنے کے لائن نہیں۔ تم بڑی آدمی ہو۔

مین۔ بڑھیا کا منہ دیکھ۔ چکی ہو رہی۔

بیوی۔ اُدھی بڑھیا۔ اُدھی اسی بات مین جھاڑ کا شا ہو گئی۔

بڑھیا۔ (بیوی سے) تم تو اس طرح بات چھاتی ہو۔ جیسے ہم دشمن ہیں۔ اسے لو! ہم تو بچی
جھلائی کے بے بات کرتے ہیں۔ یہ ہمیں سے اُدھے بڑتی ہیں۔

بیوی۔ بس اپنی خیر خواہی رہنے دو۔ ورنہ کسی کے گھر کی اجارہ دار ہو۔

بڑھیا۔ ہمارا اجارہ کون ہونے لگا۔ اب جوئی نئی آتی جا نیگی ادکا اجارہ ہوتا گیا
مین۔ بڑھیا کی اس بات پر مجھے مباحثہ نہیں آگئی۔ منہ پھیر کے بننے لگی۔

بیوی۔ کون نہیں۔ اسے تم بھی میری سوت ہونا؟ (میری طرف مخاطب ہو کے)
مے سن لو فاضا صاحب کی پہلی ہی ہیں۔ لو بیوی تم اصل مین ابھی سوت ہو۔ مین تو ابھی
بدکاری ہوں۔

بڑھیا۔ وہ سوت ہوں اپنے ہونے سوتوں کی۔ مجھے یہ باتین نہیں ابھی لگتیں۔
منہ دمنہ کا لیان دیتی ہو۔ موی کسبوں۔ خانگیوں کی صحت مین اور کیا سیکھو گی۔
ہی تو سیکھو گی۔

لو اتنے دن مجھے آئے ہوئے بڑی بیکم صاحب (اکبر علیخان کی والدہ) نے آدمی بتا
نہیں کہی۔ ہو صاحب گونستی ایسی ہیں کہ محلے کی بڑھیوں کو کھانا لیان دیتی ہیں۔
بیوی۔ (غصہ ہو کر) مین نے تم سے کہ دیا۔ لڈن کی مان۔ تم آج سے میرے پاس نہ آنا۔
وہیں بڑی بیکم صاحب کے پاس جا کے بیٹھا کرو۔

مین۔ مجھے بھی بہت غصہ تھا۔ مگر مین نے دیکھا کہ بے نیکی عورت ہے۔ اسکے منہ کوں
لگے۔ ضبط کر کے چکی ہو رہی۔

بڑھیا۔ ہماری بلا آتی ہے۔

بیوی۔ سوئی کی شانین آتی ہیں۔ یہ بلا بوجھ کیا بک رہی ہے۔

بڑھیا۔ تو کیا تمہارے بیل ہیں۔ کچھ کسی کے لینے دینے مین۔ گھڑی بھر کل آتے تھے۔
تم ہم سے بات کرتی تھیں۔ ہم تم سے بات کرتے تھے۔ نہ آئیں گے۔

بیوی۔ ہرگز نہ آنا۔

بڑھیا۔ اس ضد پر دھرم نہ بیٹھے۔ دیکھیں تم ہمارا کیا بنا لیتی ہو۔

بیوی۔ آگلی تو اتنی جوتیان لگا مین گے کہ سر مین ایک بال نہ بیٹھا۔

بڑھیا۔ کیا تاکت۔ کیا بجال۔ منہ نواد جوتیان مار نیگی۔ بڑی بھاری۔!

بیوی۔ اُدھیو۔ یہاں سے ہٹو۔ نہیں تو لیتی ہوں باغہ مین جوتی۔

بڑھیا۔ (ایک منہ لگا کے) آج تو ہم جوتیان کھا کے جائینگے۔ مارو بیٹے باپ کی بیٹی ہو۔

باپ کے نام پر بیوی کو غصہ آ ہی گیا۔ چہرہ شہ رخ ہو گیا۔ غر غر کلنے لگیں۔

بیوی۔ دوڑ ہو بہان سے کہتی ہوں۔
 بڑھیا۔ اب کوہم جو تیان کھا ہی کے جائیں گے۔
 بیوی۔ (مجھے کھلم کھلو کے) دیکھو میرے خندہ دلاری ہے۔ بے ارے موی کو نہ چھوڑو گی۔
 مین۔ بیکم جاسنے بی دیکھئے موی بے کٹی ہے۔
 بڑھیا۔ مجھے تو کچھ ہونا۔ مال زادی نئے تو کچھ ہی کھا جاؤں گی۔
 بیوی۔ جو بی پیر سے لے کے ایک۔ دو تین۔ اب راضی ہو ہیں۔
 مین۔ بیکم جاسنے دیکھئے۔ ہاتھ سے جوتی چھین لی۔
 بیوی۔ نہیں تم نہ بولو۔ موی کا کچھ مڑ کال ڈالو نہ گی۔
 بڑھیا۔ اور مارو۔

بیوی نے دوسرے پیر سے جوتی اڈانے کے پانچ چار اور کلائیٹن۔
 اب بڑھیا نے زمین پر پاؤں پھیلا دئے۔ اوڑھ میں پردہ ہٹا کر مارنا شروع کیے۔ یہی ہی ہو کر
 مجھے جوتیان مارن اب تو دل ٹھٹھا ہوا۔ سوت کی جلیں بچھڑاؤناری۔ ہاتھ مارا اٹھا ہوا۔
 جلا جلا کے دو مائی دینا شروع کی۔ باور چھانے سے ہوا میرن اوٹھ کے دھڑل
 بڑی بیکم صاحب اپنے دالان سے چلی آئیں۔ ایک۔ آفت برپا ہو گئی۔
 بڑی بیکم صاحب کو آتے دیکھ کر اور بھی دو ہٹا کر مارنا شروع کیے۔
 اس بڑھیا نے مین جھک جو تیان کھلو آئیں۔
 بیکم صاحب۔ اے مجھے کیا معلوم تھا کہ ہٹو جوتیان بڑھیا ہیں۔ نہیں آکے بجائیں۔ خسر
 بات کیا ہوئی۔
 بڑھیا۔ (میری طرف اشارہ کر کے) اس مارا (ادی نے مار کھلوائی۔ اسے اس ...
 نے مار کھلوائی۔
 مین شک ماری سی ہو گئی۔ بیکم صاحب سے مجھے ابرقت سامنا ہوا ہے۔ کچھ کہنے نہیں
 بن پڑنا۔

بیوی۔ پھر اوکھانام لئے جاتی ہے۔
 بڑھیا۔ ہم تو نام ہیں گے۔ دیکھیں تم کیا کرتی ہو۔
 بیکم صاحب۔ آخر ہر کیا تھا۔

بڑھیا۔ مجھ نگوڑی ماری نے اتنا بچھا کہ یہ کون ہیں۔ بے جلا کیا گناہ کیا۔
 بیوی۔ تم تو کہتی تھیں۔ مین جانتی ہوں۔ پھر پوچھنے سے کیا مطلب تھا۔
 بڑھیا۔ کیا مطلب تھا۔ آجھا مطلب بنا دو نکلی۔ تو یہی جو اپنا عوض نہ لے لوں۔
 خیر۔ تھنے مارا تو ہے۔
 بیکم صاحب۔ مل نقتل۔ تو کیا بد لایگی۔ اور کسی بھلا سے پر نہ بھولنا۔
 بڑھیا۔ مین تم سے کچھ نہیں کہتی۔ تم جو جی چاہے کہ لو۔ غما ماک ہے۔
 بیکم صاحب۔ میری مک والی کی ایسی تھی۔ بکل بیان سے۔
 بڑھیا۔ لو یہ بھی کھانی ہوئی آئیں۔ آجھا جاتے ہیں۔ یہ کہہ کے بڑھیا اوٹھ کھڑی ہوئی۔
 ہٹکا جھاڑ۔ چھوڑ۔ بڑبڑاتی ہوئی۔ بڑی نکالنے والی۔ جاتے ہیں۔ جاتے ہیں۔ بیکم
 کو کو نکرو نہیں آتے دتین۔

بیکم صاحب۔ (بہو صاحب سے) آخر تم اس موی ٹھیل کے منہ کون لگیں۔
 بیوی۔ امان جان۔ آپ کے سر کی تسمین نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ تو آپ ہی جیسے
 کوئی کھاٹ پر سے سو کے آئی تھی۔ سیکڑون باتیں تو ان بچاری کو سنا کے رکھن۔
 بیکم صاحب۔ میرے ذکر بیکم صاحب کچھ ناک بھون پڑھا کے چپکی ہو گئیں۔ مجھ کو
 اوس بڑھیا کی بات تو اتنی ناگوار نہیں ہوئی۔ کو نکرو مین او سکودروانی سمجھی ہوئی تھی
 مگر مان بیکم صاحب کی بے اعتنائی سے سخت صدمہ ہوا۔ وہ ابھی وہن کھڑی ہوئی
 تھیں کہ مین اوٹھ کے کھڑکی کے پاس چلی آئی اور اپنے کان مین آن بیٹھی۔
 بیکم صاحب۔ (میرے پلے آئے کے بعد ہوسے) اوٹھی بیٹا۔ تھنے اوس بڑھیا نگوڑی
 کو خواہ خواہ چھوٹ ڈالا۔ اور پھر موی ایک نقتل بانڈاری کے پلے آخر تھیں اوسکی
 پڑچک لینا کیا ضرورت تھی۔

امیرن۔ آجھا اوسکو جاسنے دیجئے۔ مہی اوسنے بدزبانی کی تھی۔ اپنی سنہ کو کتنی
 بہ لو چھپے کہ کبھی خانگیوں سے میل جول کیا۔ اور کبھی بھی وہ مین سے میان سے
 آشنا ہو۔ ابھی وہ لاکھ سر پر بچا دے تو کسی آفات ڈالتی۔ اور وہ فرض کر کے جاکے
 نکلا لائیں۔

بیکم صاحب۔ (امیرن سے) اوسکی مجال تھی۔ گھر مین لے آنا۔ ہم نہیں بیٹھے ہیں۔ باہر

جسکا ہی چاہے آئے۔ گھر میں کسی کا کیا کام ہے۔ اسے لو۔ ان سے (اکبر ملتان کے باپ سے) برسوں حسین باندی سے ملاقات رہی۔ اور اسنے کیسی منتیں کیں۔ بچے نہیں بامی بھری۔ بوا میرن میں یہ سوچی کہ آج کو ہمارے طرف کھڑی نرہیلی آئیگی کل کو میان کھر میں بٹالین گے تو یہ چھاتی پر ہونگ کون دلواسے گا۔ اپنی پت اپنے ماتھے سے۔ یہ آج کی رات کو اپنا آگم اندھے کا خیال نہیں۔

امیرن سے۔ بیگم صاحب۔ اول تو نوٹ سے برہنہ دایوں کا گھر گرسنوں میں کام ہی کیا ہے۔ اگلے لوگ کہتے تھے ایک درجہ دو کو گھر میں بلالے مگر بد عورتوں کو نہ بلایا۔ بیگم صاحب۔ بابا بات یہ ہے کہ مر داگر جلا بھی آئے گا۔ تو کیا وہ عورتوں میں گھس کے بیٹھے گا۔ کل کی بات سے بھاگ کے دوڑ میں برسوں حسین خان ہمارے گھر میں چھپے رہا پھر وہ ایک گھر کا رہنا سہنا۔ مگر حال ہے کہ اوغون نے میرا آئل تک دیکھا ہو۔ یا بات تک سنی ہو۔ دن دن بھر مٹھی میں گٹھی بچی رہی تھی۔ اما اسیلوں سے اشاروں میں بائیں کرتی تھی۔

امیرن۔ ایک تو کہ تم منجھک کی کھانے والی پوری صاحبزادی۔ جب اسیوں کے پاس بیٹھو گی کہاں تک براؤ ہو گا۔ کہیں اوسنے کچھ چوسنے کی ٹکڑیوں میں ہاتھ ڈالنا چھاری آنکھ بچاکے کوڑے میں پانی ہی پی لیا۔ دوسرے ٹوی نکھایاں انکا اتار (اعتبار کیا۔ سبکوڑوں عارضوں میں گھری ہوئی ہیں۔ ان کے نو پر تھادین سے بچنا چاہیے۔

بیگم صاحب۔ ایک بات۔ سبھی باتوں کا براؤ ہونا چاہیے۔ پر جھار ان۔ ناگھن۔ ٹوٹنے۔ ٹوٹنے۔ براؤں کے۔ (کو تو سمجھ نہیں۔ اور جو کچھ بھلا ہی دے۔ مرزا محمد علی کی ہو کو موت نے جو تک بھلا دی۔ دین دنیا سے جاتی رہی۔ نہ آل کی نہ اولاد کی۔

امیرن۔ جی مان۔ اسے لکھا میں جانتی نہیں ہوں۔

بیگم صاحب۔ بوا یہ ہونا ہے کارش۔ اباسے کہ اس میں جہاں تک آگ تھلک رہے اچھا۔ وں تو آگ تھلک رہے پر بھی جان نہیں بچتی۔ چھی کو دیکھو اس ٹوی کے کی کہاری نے کیا کوئی بات ادھار رکھی۔ دعا۔ تو یہ گسٹا۔ کیسے کیسے فتن

یہ سے سرحانے سے کھٹنے تھے۔

امیرن۔ پھر اس۔ کو اپنے گھر میں کون آنے دیا۔

بیگم صاحب۔ اے بوا تو کہی۔ میں کیا جانتی تھی کہ اس سے میان سے لگا سکا ہے۔ جس دن معلوم ہو گیا۔ میں نے کھڑے کھڑے کھال دیا۔

امیرن۔ مگر بیگم ایک بات کہو گی خدا لگتی۔ آپ کی خدمت بہت کی۔

بیگم۔ بہت کہی۔ میان کو چھینا تھا۔ اب کیا اس سے بھی گئی گذری۔ اس بڑھیا کو کیا سمجھتے ہو۔ ان سے بھی کسی زمانے میں میان سے تھی۔

امیرن۔ (غصہ لگا کے) نہیں بیگم صاحب۔

بیگم صاحب۔ کیا میں جوڑ کون کی جب ہی خودہ ڈھرائی تھی کہ اپنا عوض لیو گی۔

امیرن۔ بوا صاحب تو پھر آپ کو نہیں پنا ہے غائب سرے کی حرم کو اپنی جوتیان۔

بیگم صاحب۔ برا ان لوگوں کو یہ لکھا کہ ان۔ سچ کہوں مجھے بھی۔ بات ناگوار ہوئی۔ ان کے منہ پہ کپتی ہوں۔ آج کو سوئی چھائی کے چلے بس سرے کی حرم کے جوتیان مارین کل کو ماس کو مارینگلی۔

امیرن۔ نہیں خدا نہ کرے۔ مگر ان بات کہنے ہی میں آتی ہے۔ ان دونوں میں نے بوا صاحب پجاری کو ایسے کو پنے دیے کہ آخر کہ پجاری چھین مار مار کے روٹنے لگی۔ میرا یہ حال تھا کہ انکاروں پر لوٹ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ دونوں بڑھوں کا نہ فوج لون۔

رسوا۔ مامین۔ مامین۔ یہ نصرت۔

دو کیے گا خدا طبیعت کو۔

کہیں ایسا ہو کہ غصت ہو۔

امراؤ۔ مرزا صاحب غصے کی بات ہی تھی۔ ایک انسان کو اتنا ذلیل سمجھنا انتہا سے بعید ہے۔

رسوا۔ یہ سے نزدیک تو کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر آپ کو اتنا غصہ آیا۔ وہ دونوں بڑھیاں سچ کہتی تھیں۔ اور ان کی مان بھی پجاری نا حق تھی۔ حق تو یوں ہے۔ اب آپ جاے بڑا مین۔ چاہے بھلا۔

امراؤ۔ واہ مرزا صاحب آپ خوب انصاف کرتے ہیں۔

رسوا۔ جی ہاں میرے نزدیک انصاف یہی ہے۔ اس معاملے میں آپ بھی ایک
تک سب تصور نہیں۔ سارا تصور اکبر علیخان کا بیوی کا تھا۔

اعراؤ۔ اون بچاری کا کیا تصور تھا۔

رسوا۔ ایسا تصور تھا کہ اگر میری بیوی ایسا کرتی۔ تو فوراً ڈولی بلوا کے اون کے قہقہے
بھجوا دیتا۔ اور چہہ جیسے تک صورت نہ دیکھتا۔ آجھا ایک بات پوچھتے ہیں۔

اکبر علیخان نے جب یہ واردات سنی تو کیا کہا۔

اعراؤ۔ کیا کہا۔ سن کی مان پر خوب ہنسنے۔ خوب چلائے۔ کہدیا۔ خبردار۔ یہ ڈائن
ہمارے گھر میں دم لے پائے۔ کئی مہینے تک اسکا انا جانا موقوف رہا۔ جب بڑے
خانصاحب آتے ہیں تو وہ پھر آنے لگی۔ یہ نصیحت اون کے آگے تھیرا گیا تھا۔ وہ اونکے
اکبر علیخان کی بیوی پر غصا ہوئے۔

رسوا۔ بڑے کی عقل صحیح تھی۔

اعراؤ۔ عقل صحیح تھی۔ یا سنا گئے تھے۔ نہ اٹھن کی مان پاؤں دبا دیا کرتی تھی۔
اسی سے اسکی پڑچک لیتے تھے۔ کیون نہ پڑچک لیتے۔ تن کی مان اونکی پڑائی
آشنا تھی۔

رسوا۔ پھر آپ ہی قائل ہوئیے۔ یہ عین وضعداری تھی۔ آجھا۔ آپ ایک بات اور
بتا دیجیے۔ تن کی مان جوانی میں کوئی رنڈی تھی یا گھر گرسٹ۔ اور براہیرن کوئی
اعراؤ۔ تن کی مان نوی دھینی تھی۔ جوانی میں خراب ہو گئی تھی۔ براہیرن
ایک دیہاتی عورت تھیں اکا کا مکان سندیلے کے ضلع میں تھا۔ ایک جوان بنا تھا
وہ بھی بڑے خانصاحب کے پاس ڈکر تھا۔ ایک لڑکی تھی۔ وہ کہیں باہر جاتی تھی
رسوا۔ براہیرن سے اور بڑے خانصاحب سے ڈکر کی عقل تھی۔

اعراؤ۔ نہ خدا کو جان دینا ہے۔ براہیرن بڑی نیک عورت تھی۔ سارا مہلہ کہتا تھا کہ وہ
جوانی میں رانٹا ہو کے میرے یہاں ڈکر کی کو آئی تھی اوسدن سے کسی نے اسکو
بدراہ نہیں دیکھا۔

رسوا۔ پورے واقعات آپ کے بیان سے مجھ کو معلوم ہو گئے۔ اب پوچھیے آپ کیا
پوچھتی ہیں؟

اعراؤ۔ تو کیا کوئی مقدمہ آپ فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں۔

رسوا۔ بہت بڑا مقدمہ ہے۔

بات یہ ہے کہ عورتیں تین طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک نیک عورتیں۔ دوسری خراب ہیں۔
تیسری۔ باہادیاں اور دوسری قسم کی عورتیں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ
جو چوری چھپے عیب کرتی ہیں۔ دوسری وہ جو کھلم کھلا بدکاری پر اتر رہی ہوتی ہیں
نیک بچوں کے ساتھ صرف وہی عورتیں مل سکتی ہیں جو بدنام نہ ہو گئی ہوں۔ کیا تمہیں
اتنی سمجھ نہیں ہے کہ وہ بچاریاں جو تمام عمر چار دیواریوں میں قید رہتی ہیں۔ ہزاروں
قسم کی مصیبتیں اٹھاتی ہیں۔ آپ مجھے وقت کے نسب ساتھ ہوتے ہیں۔ مگر بڑے
وقت میں یہی بچاریاں ساتھ دیتی ہیں۔

جس زمانے میں اون کے شوہر جوان ہوتے ہیں۔ دولت پاس ہوتی ہے تو اکثر
باہر دایان فرسے اڑاتی ہیں۔ مگر غلطی اور بڑھاپے کے زمانے میں کوئی پرمان
حال نہیں ہوتا۔ ان وقتوں میں وہی طرح طرح کی بکلیفیں اٹھاتی ہیں۔ اور
بڑوں کی جان کو صبر کرتی ہیں۔ پھر کیا ادھیں اسکا کوئی محسوس ہوگا۔ یہی خیر کا
ہوتا ہے کہ وہ خراب عورتوں کو بہت ہی بڑی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ انہما کا دلیل
تجھتی ہیں۔ تو بہ اور استغفار سے خدا گناہ معاف کر دیتا ہے مگر یہ عورتیں بھی نہیں
معاف کرتیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ گھر کی عورت کسی بی
خوبصورت خوب سیرت اور خوش سلیقہ کیون جو بے وفات مرد بازار دیوں رہا ہو
صورت اور دوسری صفوں میں بدرجہا بہتر ہیں فریفتہ ہو کر ادھیں عارضی طور سے
یادداشت لہر کے لئے ترک کر دیتے ہیں۔ اسلئے اونکو گمان کیا بلکہ یقین ہے کہ کسی کی
قسم کا جادو ٹوٹا ایسا کر دیتی ہیں جس سے مرد کی عقل میں خور آ جاتا ہے۔ یہی انکی
ایک قسم کی نیکی ہے۔ اسلئے کہ وہ اس حال میں اپنے مردوں کو الزام نہیں دیتیں بلکہ
برکار عورتوں ہی کو مجرم ٹھہراتی ہیں۔ اس سے زیادہ اونکی محبت کی اور کیا دلیل
ہو سکتی ہے۔

اعراؤ۔ یہ تو سب صحیح ہے مگر مرد کیون ایسے بے وفات بناتے ہیں۔
رسوا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انسان کے فرائض میں بدلت پسندی ہے۔ ایک حالت میں زندگی

بسر کرنے سے خواہ وہ حالت کیسی ہی عمدہ کہوں نہ ہو طبیعت اویکتا جاتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کسی نہ کسی کا تیزاویسکی حالت زندگی میں پیدا ہو۔ شاید ان بازاری کے ساتھ معاشرت کرنے میں اسے ایک قسم کی نئی لذت ملتی ہے جو کبھی اس کے خیال میں تھی یہاں بھی ایک ہی کے قمار پر لگتا نہیں کرتا۔ بلکہ حدت کی تلاش میں روز نئے کمرون پر بھونچتا ہے اور نئے گھر دیکھتا پھرنا ہے۔

امراؤ۔ مگر سب مرد ایسے نہیں ہیں۔
رسوا۔ ہاں یہ سچ ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ حسن معاشرت کے قانون نے اس امر کو میسر فرما دیا ہے۔ جو شخص ایسا کرتے ہیں ان کے عزیز و اقارب دوست احباب ملاحت کرتے ہیں اس خوف سے اکثر جرات نہیں ہوتی۔ مگر جب اس غوان انشاپلین کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے وہ طرح طرح کی لذتوں کا ذکر کر کے ایک عجیب قسم کا شوق اونیکی طبیعت میں پیدا کر دیتے ہیں۔ اسلئے وہ خوف ان کے دل سے نکل جاتا ہے۔ آپ کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوا ہو گا کہ جو لوگ پہلے پہل دہڑی کے مکان پر جاتے ہیں۔ ان کو اخلاصے داد کا کس قدر خیال ہوتا ہے۔ کوئی دیکھتا نہ ہو۔ کوئی شہ نہ لے۔ دو آدمیوں کے سامنے قہقہے کا کیا ذکر۔ تجلیے میں بھی منہ سے بات نہیں نکلتی۔ مگر رفتہ رفتہ یہ حالت بالکل زائل ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ چند ہی روز میں پورے بے غیرت ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر کیا ہے دن و رات سے سرچک رہنے والوں کے کمرون پر کھٹ کھٹ کر کے چڑھنا۔ گھاڑی میں کھڑکیاں کھلنے کے ساتھ بیٹھ کر سر کرنا۔ ماتھ میں ماتھے کے نیلے تاشون میں لیے پھرنا۔ ان سب قانون کو غور سمجھنے لگتے ہیں۔

امراؤ۔ یہ تو صحیح ہے۔ مگر خیر و ن میں ان قانون کو چنداں مہرب نہیں سمجھتے۔
رسوا۔ خصوصاً دہلی۔ لکھنؤ میں۔ اور یہی ان شہروں کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوا۔ دیہات اور قصبات میں ایسے شرلوگوں کی صحبت کم ملتی ہے جو جو قانون کو ان بدکاریوں پر آمادہ کریں۔ دوسرے دکان کی دہڑیوں کو اس قدر اقتدار حاصل نہیں ہے۔ اسلئے وہ دوسرا اور ہندوؤں کی سطح فرمان ہوتی ہیں۔ اور بہت ہی ڈرتی ہیں کہ ان کا آدو قہ بلکہ زندگی ان کے دست قدرت میں ہے اسلئے

اونکی اولاد سے بہت ہی جوری چھپے ملتی ہیں۔ اور شہروں میں نوازدادی ہے۔
کون کسکا دباؤ ماننا ہے۔ اوسکی کا یہ نتیجہ ہے۔

امراؤ۔ مگر دیہاتی جب بگڑتے ہیں تو حد سے زیادہ بگڑ جاتے ہیں۔ مثلاً بیان ارشد علی کا واقعہ آپ سن چکے ہیں۔

رسوا۔ اسکا یہ سبب ہے کہ وہ ان لذتوں سے بالکل مابلد ہوتے ہیں۔ جب انکو اسکا چکا پڑتا ہے تو وہ اسکی حد سے زیادہ قدر کرتے ہیں۔ اور اہل شہر کچھ نہ کچھ آگاہ ہوتے ہیں۔ اسلئے ان کو زیادہ شغف اور اہٹناک نہیں ہوتا۔

رسوا۔ ہاں وہ آپ کی فوجی کیا ہوئی۔ اُنے بے بھلا سنا نام تھا۔

امراؤ۔ آبادی۔

رسوا۔ آبادی۔ صورت تو اچھی تھی۔ میں نے اس وقت میں دیکھا تھا۔ جب تو اسکا بس کوئی دس گیارہ برس کا تھا۔ جوانی بن تو اور بگڑ گئی ہوگی۔

امراؤ۔ مزا صاحب آپ کو خوب یاد ہے۔

رسوا۔ یاد کیا چاہیے۔ واقع میں بہت قطدار عورت ہوگی۔ ہم بھی اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ کبھی تو جرات ہوگی۔

امراؤ۔ قویہ کہیے۔ آپ بھی بی آبادی کے امیدواروں میں تھے۔

رسوا۔ اب۔ امراؤ جان۔ میری ایک بات یاد رکھنا۔ جہاں کوئی حسین عورت نظر پڑے۔ مجھے ضرور یاد کر لینا۔ اگر ممکن ہو تو امیدواروں میں نام لکھوا دینا۔ اور جو بن

مرباؤں (خدا خواستہ) وزیر سے نام پر ماتھ دے دینا۔

امراؤ۔ اور اگر کوئی مرد میں نظر آئے۔

رسوا۔ اپنا نام اس کے امجد واروں میں اور میرا نام اسکی بہن کے امیدواروں میں لکھوا دینا۔ بشرطیکہ شرعاً منع نہ ہو۔

امراؤ۔ کیا خوب۔ شرع کو کہاں دخل دیا ہے۔

رسوا۔ شرع کا دخل کہاں نہیں ہے۔ خصوصاً ہماری شہر جس میں کوئی بات فرود گشت نہیں کی گئی۔

امراؤ۔ سیدھی سی ایک یہ بات کہون نہیں کہہ دیتے۔

ع۔ مٹھنا تو جالتے ہیں عرفا درست ہے۔

رسوا۔ یہ اور موقوفوں پر کہا جاتا ہے۔ امراؤ جان میری زندگی کا ایک اصول ہے۔
نیکجنت عورت کو میں اپنی مان بہن کے برابر سمجھتا ہوں خواہ وہ کسی قوم اور ملت
کی کیون ہو۔ اور اسی حرکتوں سے بلکو سخت صدمہ بھونچتا ہے جو اس کی پارسائی میں
خلل اندازہ ہوں۔ جو لوگ اس کے درغلانے یا بدکار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔
غیری راے میں قابل گولی مار دینے کے ہیں۔ مگر فیاض عورتوں کے فیض سے نصیب
ہونا میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں ہے۔

امراؤ۔ سبحان اللہ!

رسوا۔ میرا اب اس فتنو لیا ت کو رہنے دیجئے۔ آبادی جان کا حال کیلئے۔

امراؤ۔ مرزا صاحب اگر آپ دیکھو جو انی کے عالم میں دیکھتے تو یہ شہر ضرور آپ کی زبان
پر ہوتا۔

جوان ہونے ہی وہ تو ادھی کچھ ہو گئے اے دل۔

کہان کی پاکبازی ہم بھی اب تیت بدلتے ہیں!

جوان ہو کے اسے وہ صورت شکل نکالی تھی کہ سو پاس نہ لڑوں میں ایک تھی۔

رسوا۔ اب کیا ہوئی۔ خدا کے لیے جلدی کیجئے۔ حرج شہر علی گئی۔ مرگئی۔ جنسر

آفت ہی کیا ہوئی۔ جو آپ ایسے یا ہوس کے کلمات کہتی ہیں۔

امراؤ۔ ہم سے گئی۔ جہان سے گئی۔ رسوا۔ آخر ہے اب کہان؟

امراؤ۔ اسپتال میں ہے اور کہان ہے۔ رسوا۔ یہ کہیے۔ شکل جو انی شگفت۔

امراؤ۔ جی ماشاء اللہ سے خوب بھولی۔ عیالین۔ صورت بگڑ گئی۔ رنگت اولٹا تو

ہو گئی۔ ناک نیچھ گئی۔ نام بدن میں مٹے پڑ گئے۔ بال گر گئے۔ حلق میں چھید

ہو گئے۔ غرض کہ شہر کرم ہو گئے۔ اب جان کے لائے پڑے ہوئے ہیں۔

رسوا۔ یہ ہوا کیا تھا۔

امراؤ۔ ای کچھ ہوا کیا تھا۔ نوے لڑکوں گھیری۔ سفلی۔ چھوڑی۔ میں نے بہت جا با
کر آدمی بنے۔ نہ بنی۔ میں نے کیا نہیں کیا۔ اسنادی کو نوکر رکھا۔ قیلم دینا شروع کیا۔

گمراہ کا دیدہ ایسی باتوں میں کب گناہا جب سے جوان ہوئی۔ میں نے کمرہ ملا

کر دیا تھا۔ شہر کے چند ذات شریف اس کے بیٹھے گئے۔ دن رات کالم۔ کلوج۔ دھنگا

مشتی۔ جو تم۔ جانا۔ ایک آفت تھی تھی۔ ناک میں دم ہو گیا تھا۔ کسی پرست نہیں۔

جو آیا۔ وار۔ میں نے مارا۔ بیٹا۔ سمجھایا۔ مگر وہ کب سنسی تھی۔ بیٹھنے ہی سے اس کی گھا

بد تھی۔ اس زمانے میں نو آئینی کا فاسد نہیں آیا کرتا تھا۔ اس سے کیلا کرتی تھی۔

میں نے یہ خیال کیا۔ سچے ہیں کھیلنے دو۔ آخر کچھ ایسی باتیں آنکھ سے دیکھیں کہ جن کی

آمد رفت موقوف ہوئی۔ ایک صاحب میرے پاس شریف لایا کرتے تھے۔ ذرا خوش

گلو تھے۔ میں گرایا کرتی تھی۔ ادن سے چھپر چھاڑ شروع کی تھے تو شریف فاندان سے

مگر طبیعت باجی تھی۔ زیل لکھا گیا۔ نہ اپنی حیثیت دیکھی۔ ایک دن ہر شام دیکھتی کیا ہوں

ڈیڑ سی میں بی آبادی سے باتیں ہو رہی ہیں۔

چھٹن صاحب۔ اسی میں تو تیری صورت کا عاشق ہوں۔ مائے آبادی کیا کروں

امراؤ جان سے ڈرتا ہوں۔

آبادی۔ ہوا ایسی باتیں مجھے نہ کیا کرو۔ ڈر کا ہے کا۔

چھٹن نے آبادی کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔

خالم۔ کیا پیاری پیاری صورت ہے۔

آبادی۔ پھر تمہیں کیا؟

چھٹن۔ (ایک سوسہ لے کے) ہمیں کید مارتے ہیں۔ جان جاتی ہے۔

آبادی۔ مٹے پارے تو دے نہیں جاتے مرنے میں میان مرنے ب کو دیکھا ہے

جانہ کسی کا بھی نہیں دیکھا۔

چھٹن۔ جا آئے! جان حاضر ہے۔

آبادی۔ گلوڑی جان کو میں لے کے کیا کروں۔

چھٹن۔ (ہماری جان کسی کام کی ہی نہیں۔)

آبادی۔ اب باتیں نہ بناؤ۔ چوٹی جیب میں پڑی ہو تو دیتے جاؤ۔

چھٹن۔ واللہ۔ امان کی خواہ نہیں تھی۔ پرہون ضرور ضرور لینا آؤں گا۔

آبادی۔ اچھا تو اب جان چھوڑو۔ جاؤ۔ چھٹن۔ اچھا تو ایک۔ بسہ نوادر دے دو۔

کی جو روئے روئی پڑے کا دعویٰ کیا۔ ذریعہ رو بہ بیسے کی دگری ہو گئی۔ مین رو بہ
 خواب دیتے تھے۔ غیرت رو بہ مین کیا ہوتا۔ اوپر کی آمدنی پر سرخشی۔ اس سے بھی
 کچھ نہ چلی۔ بی آبادی کسی قدر چٹوری بھی تھیں۔ آخر میان حسین علی کے گھر سے
 محل کے محلے کے ایک لڑکے نئے کے ساتھ بھاگیں۔ اس لڑکے کی ماں پٹھانی لکھی
 بڑے مشہور دن مین مین۔ جہان دو چار قندریان اور رہتی تھیں۔ وہیں ایک بکا
 لٹکانا ہو گیا۔ بی پٹھانی کی روزی مین کسی قدر اور دست ہوئی۔ نئے براے نام
 دیکھے۔ میان مین کے ایک پیر پٹھانی میان سادات پٹھانی کو بل دے کے وہاں سے
 لے آئے۔ یہ اپنی ماں پاس لے گئے۔ مکی والدہ کو مرغیوں سے شوق تھا۔ مکان
 کے پاس ایک کچھ تھا۔ وہاں مرغیان چرا کرتی تھیں۔ بی آبادی اونچی حفاظت پر
 متنب ہوئیں۔ میان سادات کسی کا نشانے مین کام کرتے تھے۔ دن بھر وہاں چلے
 جاتے تھے۔ یہ مرغیان بکا یا کرتی تھیں۔ وہاں انھوں نے محمد بخش گھر کچھ دن کے
 لڑکے سے راہ دیکھ سدا کی۔ بلکہ سادات کی ماں نے یہ معاملہ دیکھ بھی لیا بیٹے سے
 کہا۔ اسے خوب جوئے مارے۔ میان محمد بخش کے ایک اور بار تھے۔ میان امیر۔ تو
 امیر مرزا کے قندھاروں مین ذکر تھے۔ یہ مین ناشیسی مین طاف تھے وہ اوڑھے گئے۔
 انھوں نے ایک مکان مین لجا کے رکھا۔ یہاں او باروں کا مجمع بھی رہتا تھا۔ بی آبادی
 سب کی دلوئی مین مصروف رہیں۔ اس زمانے مین نہیں معلوم کسی برکت سے خوب
 بھولی بھلیں۔ بھلا اب میان امیر کے کس کام کی تھیں۔ اسے اوٹھا کے ہسپتال
 مین چکوا دیا۔ بالفضل مین شریف رکھتی ہیں۔ اگر آپ فرمائیے تو بلوا دیا جائے۔
 رسوا۔ مجھے توصات ہی کیجئے۔

ما تھ آئی مراد منہ مانگی

دل نے پائی مراد منہ مانگی

رجب کی فوجدی تھی۔ کچھ بیٹے بیٹے سے دل مین آئی۔ چلو دکھاہ جائیں۔ زیارت
 ہی کریں۔ سہرا مین اب روکے چھوٹے۔ بڑا مجمع غائب ہے تو مین مرادنی دیکھا کے مین
 مین ادھر ادھر مین ہلا کی۔ پھر جا کے تمعین جلا مین۔ جاہری چڑھائی۔ ایک صاحب

مشر پڑا رہے تھے۔ ادھن سننا۔ پھر ایک مولوی صاحب آئے۔ انھوں نے حدیث
 پڑھی۔ اس کے بعد نام ہوا۔ اب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ مین نے بھی زیارت
 رخصتی پڑے واسی کا ارادہ کیا۔ دروازے تک چھوٹے کے مین آبا۔ زانی دیکھا
 مین ہوتی چلوں۔ نوہ خوانی کی شہرت۔ اور خواب۔ مگر کثرت کی سہارے نسل کو جو
 سے اکثر عورت مین جھکو جانتی تھیں۔ مین نے خیال کیا کہ: چار مل ہی جائیں گی۔ اسی
 بہانے سے ملاقات مین ہو جائیں گی۔ سوار ہو کے چھوٹے پر پردہ ڈال کے زانی دیکھا
 کے دروازے پر چھوٹی۔ محلدار نے اسے سواری اور خروائی۔ اندر گئی۔ میرا خیال غلط
 نہ تھا۔ اکثر عورتوں سے سامنا ہوا۔ جھکے۔ نکالیں۔ غار کے حالات ادھر ادھر
 کی باتیں ہو آئیں۔ بڑی دیر ہو گئی۔ مین واپس آئے ہی کوٹھی کراہتے مین دیکھتی کیا
 ہوں۔ وہی طرف کی فوجی سے کا پور والی بگیا صاحب بھی آئی ہیں۔ بیٹے مٹھا
 ہیں۔ وہاں جوڑا پہنے ہوئے ہیں۔ چار پانچ مہیاں ساتھ مین۔ ایک ہاتھ نہٹا
 ہوئے ہے۔ ایک کے ہاتھ مین نکلیا ہے۔ ایک لوطیہ فاصلہ مین لے رہے۔ ایک کے پاس
 بیسی مین تبرکات ہیں۔ مجھے دھڑ سے دیکھتے ہی دوڑیں۔ کندھے پر ہاتھ رکھتے۔
 بگم۔ اندر ادھر تم بڑی بے روت ہو۔ کا پور سے جو غائب ہو مین۔ تو آج ملی ہو۔ وہ
 بھی اتفاق سے۔

مین۔ کیا کہوں۔ جس دن آج کے بلخ مین رات کو رہی تھی۔ اسی دن صبح کو لکھنؤ
 سے لوگ آئے مجھے پکڑ کے لکھنؤ لے گئے۔ پھر جاگرد ہوئی۔ قدا جلتے کہاں کہاں ماری
 بھری۔ نہ مجھے آپ کا پتا تھا۔ نہ آپ کو میرا حال معلوم تھا۔

بگم۔ خیر۔ اب تو ہم تم دونوں لکھنؤ مین ہیں۔

مین۔ لکھنؤ کیسا اوقات تو ایک ہی مقام پر ہیں۔

بگم۔ اسکی سند نہیں۔ مین میرے مکان پر آنا ہو گا۔

مین۔ سزا کھوں سے۔ مگر آپ رہتی کہاں ہیں؟

بگم۔ جو بیٹوں پر۔ نواب صاحب کو کون نہیں جانتا۔

مین۔ پوچھنے ہی کو تھی کہ کون نواب صاحب۔ اتنے مین ایک مہری بول اومٹی۔

ادب محمد تھی خان کا مکان کون نہیں جانتا؟

مین۔ میں نے آنے کو تو آؤں۔ مگر ذرا بھابھ کے غلام نہ ہو۔

بیگم۔ نہیں وہ اس طبیعت کے آدمی نہیں ہیں۔ اور پھر بھابھ سے واسطے۔ میں نے اس رات کا حال رتی۔ نی اون سے کہا تھا۔ اونھوں نے تو خود تمہیں کانپور میں کئی مرتبہ دھندھوایا۔ اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔

مین۔ آجھ تو ضرور آؤں گی۔ بیگم۔ کب آؤ گی۔ وعدہ کرو۔

مین۔ ابکی جمعرات کو حاضر ہوئی گی۔ بیگم۔ ادھی۔ یہ جمعرات کی ارواح تم کب سے ہو گئیں۔ ابھی تو پورے آٹھ دن ہیں۔

مین۔ ادھر ہی کیوں نہیں آئیں۔ بیگم۔ آجھ تو اگلی سیر کو آؤ گی۔

بیگم۔ اتوار کو آؤ۔ خواب بھی گھر میں ہوں گے۔ پیر کے دن شاید کسی انگریز سے ملنے چلے جائیں۔

مین۔ مناسب ہے۔ اتوار ہی کو سہی۔ بیگم۔ کس وقت آؤ گی؟

مین۔ جس وقت کہیں۔ مجھے گھر پر کوئی کام نہیں۔ ہر وقت برابر ہے۔

بیگم۔ تم کہاں رہتی ہو۔

مین۔ جوگ میں سید حسین خان کے چھانکے پاس۔

بیگم۔ آجھا تو میں ہری کو بھیج دوں گی۔ اسی کے ساتھ چلی آنا۔

مین۔ یہ بہت آجھا ہے۔ بیگم۔ آجھا تو خدا حافظ!۔

مین۔ خدا حافظ۔ ان یہ نوکریے صاحبزادہ کیسا ہے۔

بیگم۔ نہیں۔ ماننا ارشد آجھا ہے۔ اور اب انھوں نے یاد کیا۔

مین۔ کیا کہوں۔ باتوں میں کیسی بھولی۔ اور بھولی کیا۔ جب جاہلی تھی تو چھون

ایک نہ ایک بات نکال آتی تھی

بیگم۔ اب تو سنانی سے ذرا ہوش نہ لایا ہے۔ آجھا اس دن اسے بھی دیکھ لیا۔

مین۔ رات کی نیت حرام۔ لے اب کچھ نہ کہیے۔ خدا حافظ۔

بیگم۔ خدا حافظ۔ دیکھو ضرور آنا۔ مین۔ ایسی بات ہے۔

آئیں میں ابھی لے دیکھا کہ باتوں کا پھر سلسلہ چلا کہنے لگی۔ بیگم صاحب چلے۔ دیر

سواری لگی ہے۔ کھارٹو سے چلا رہے ہیں۔

ہر چند بہت غور کیا سمجھنے شب و روز
دنیا کا طلسمات سمجھ میں نہیں آتا

مین خانم سے علیحدہ ہو گئی تھی مگر جب تک وہ جیتی رہیں اور غمیں اپنا سر پرست بگھا کی۔ اور سچ یہ ہے کہ اور غمیں بھی مجھے محبت تھی۔ اون کے پاس اس قدر دولت تھی کہ طبیعت غنی ہو گئی تھی۔ سن جو زیادہ ہو گیا تھا تو دنیا کی طرف سے اونکی طبیعت پھر گئی تھی۔ اب اونکو کسی کی کمائی سے کچھ مطلب نہ تھا۔ مگر محبت اسی طرح کرتی تھیں۔ وہ اپنے جیسے جی کسی فوجی کو اپنے سے جدا نہ سمجھتی تھیں۔ مجھے تو اونکو خاص محبت تھی۔ بسم اللہ نے اونکو بہت آزاد دیے اسلئے اور غمیں اس سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ لیکن پھر اولاد غنی۔ نور شیدہ جان بھی غم کے بعد آگئی تھیں۔ وہ خانم کے پاس رہتی تھیں۔ امیر جان نے علیحدہ کمرہ لے لیا تھا مگر وہ بھی اتنی جاتی رہتی تھیں۔

جو کمرہ خانم نے مجھے دیا تھا وہ اونکی زندگی بھر مجھے خالی نہیں کرایا گیا تھا۔ میرا اسباب اوسمیں بند رہتا تھا۔ میرا قفل لگا تھا۔ جب جی چاہتا تھا تو دو تین من ان دہن جا کے رہتی تھی۔ سال بھر کہیں رہوں۔ مگر محرم میں تفسد یہ داری وہیں کرتی تھی۔ میرے نام کا فریہ خانم مرتے دم تک رکھا کین۔

جمرات کو بیگم سے ملاقات ہوئی تھی۔ جمعہ کو آدمی آیا کہ خانم صاحب کی طبیعت کچھ علیل ہے۔ تمہیں یاد کرتی ہیں۔ میں فوراً سواری ہو کے گئی۔ اور غمیں دیکھ کے گھر پر داپس آنے کا ارادہ تھا۔ کہ جی میں آیا ایک بھاری جڑا کھانسی لیتی چلون۔ کمرہ کھولا۔ دیکھا۔ کمرے میں چاروں طرف جالے لگے ہیں۔ پلنگ پر سون کر پڑی ہوئی ہے۔ نرس فروشس اور ٹا ہوا پڑا ہے۔ ادھر ادھر کھڑا پڑا ہے۔ یہ حال دیکھ کے مجھے اپنے اگلے دن یاد آئے۔ اللہ ایک وہ دن تھا کہ یہ کمرہ ہر وقت کیسا بجا بجا رہتا تھا۔ دن بھر میں چار مرتبہ تھوڑی تھوڑی تھی۔ مجھوٹے جھاڑے جلتے تھے گرد کا نام نہ تھا۔ تک تک کہیں پڑا رہتا تھا۔ یا اب یہ حال ہے کہ دم بھر مجھے کوئی نہیں چاہا۔

دی پلنگ جسر بن سوئی تھی۔ اب اوپر پاؤں رکھتے ہوئے کراہت معلوم ہوتی ہے۔ آدمی ساتھ تھا۔ میں نے اوس سے کہا۔ ذرا جالے تولے۔ وہ ایک سیٹھا کہیں سے ڈھونڈھ کے اٹھا لایا۔ جالالینے لگا۔ انہی دبر میں من نے اپنے ہاتھ سے دری اوٹنی۔ آدمی نے اور میں نے بل کے دری بچائی۔ چاندنی کو ٹھیک کیا۔ جب فرس دست ہو گیا تو میں نے پلنگ کے بچو نے اور ٹھوڑا کے تھروائے۔ کوٹھری میں سے نکھار دان۔ پانڈان۔ اوگالڈان۔ اوٹھالائی۔ سب چیزیں اپنے اپنے فریے سے نکھار۔ جس طرح کسی زمانے میں لگی رہتی تھیں۔ خود پلنگ سے تکیہ لگا کے بیٹھی۔ آدمی کے پاس خاصدان تھا۔ پان سے کے کہا یا۔ آٹھ ساٹھ لگا کے مٹہ دیکھنے لگی۔ اگلا زمانہ یاد آ گیا۔ شباب کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ اوس زمانے کے فردا دن کا حضور بندہ گیا۔ گوہر مرزا کی شہادت۔ راشد علی کی حماقت فیض کی محبت۔ سلطان صاحب کی صورت۔ غرض کہ جو صاحب اس کمرے میں آئے تھے۔ مع اپنے اپنے خصوصیات کے سرے پیش نظر تھے۔ وہ مکرہ ہونے کا توں خیال بن گیا تھا۔ ایک تصویر کھینچ کے سامنے آتی تھی۔ اور غائب ہو جاتی تھی۔ پھر دوسری سامنے آتی تھی۔ جب کل صوفین نظر سے گذر چکین تو یہ دورہ از سر نو پھر شروع ہو گیا۔ پھر وہی صوفین ایک دوسرے کے بعد پیش آتے۔ پہلے تو ایسے کئی دوسرے جلد جلد ہوئے۔ اب ذرا توقف ہونے لگا۔ اب جبکہ ہر تصویر پر زیادہ تر غور و فکر کرنے کا موقع ملا۔ جو واقعات جس شخص کے متعلق تھے اوپر تفصیلی نظر پڑنے لگی پہلے جب دلوغ کو چکر ہوا تھا تو صرف چند ہی تصویریں نظر آتی تھیں۔ اب ہر تصویر سے بہت سی نکلیں۔ اور خانوس خیال کی دست بڑھنے لگی۔ تمام زندگی میں جو کچھ دیکھا۔ سب نگاہ کے سامنے تھا۔ اس اثنا میں ایک مرتبہ سلطان صاحب کا پھر خیال آیا۔ تو اس کے ساتھ ہی پہلے مجھے کا نام جلد میں سلطان صاحب کو دیکھا تھا۔ اور دوسرے دن اوں کے مذہب کا آنا۔ پھر اودھ کا خوشنویس لاسر سے منے کی باتیں شغور و سخن کا چرچا۔ خان صاحب کا کل محبت ہونا۔ بدزبانی کرنا۔ سلطان صاحب کا پتھر مارنا۔ خان صاحب کا گر پڑنا۔ خیر غیاں کی جان نثاری۔ کوڑا ل کا آنا۔ خان صاحب کا گھر پر چھوڑنا۔ مگر سلطان صاحب کا نہ آنا۔ محفل میں اونکو دیکھنا۔ لڑکے کے ہاتھ دھو بیٹنا۔ پھر از سر نو رسم ہونا۔ نواز گنج کے جلے۔ یہ سب واقعات اب طرح سے

معلوم ہوتے تھے جیسے کل ہوئے ہیں۔ یہ دورے برابر چل رہے تھے۔ مگر جب پہلے مجھ سے کے بعد سلطان صاحب کے آدمی کا پیام بے کے آنا یاد آنا تھا۔ تو طبیعت کچھ رنگ سی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس موقع پر کچھ چھوٹ جاتا ہے۔ اتنے میں آدمی نے زور سے ایک سچ ماری۔

آدمی۔ بوی دیکھئے وہ کھنکھوڑا آپ کے دوپٹے پر چڑھا جاتا ہے۔ میں۔ اڑھی کہہ کے اوٹھ بیٹھی۔ جلدی سے دوپٹہ اوتار کے پھینک دیا۔ الگ جاکھڑی ہوئی۔ آدمی نے دوپٹہ اوٹھا کے جھاڑا۔ کھنکھوڑا پٹ سے گرا۔ اور رنگ کے پلنگ کے سر حائے کی طرف ہائے کے نیچے گھس گیا۔ آدمی نے پلنگ کا پایہ اوٹھا اب جو دیکھئے ہیں تو پائے کے نیچے پانچ اشرفیان برابر بھی ہوئی ہیں۔

آدمی (بہت ہی شجب ہو کر)۔ ہائیں۔ اسے بیٹھے یہ کیا ہے؟ میں۔ (دل میں) آنا۔ یہ وہ اشرفیان ہیں۔ (آدمی سے) اشرفیان ہیں۔ آدمی۔ واہ اشرفیان یہاں کہاں سے آئیں۔

میں۔ (ہنکے) وہ کھنکھوڑا اشرفیان بن گیا۔ اچھا اوٹھا لو۔ آدمی۔ پہلے تو ذرا جھوٹا۔ پھر پانچوں اشرفیان اوٹھا کے نیچے والے کین۔ رسوا۔ تو کیا خان کا مکان عند ربین نہیں تھا۔

احراؤ۔ لٹا کون نہیں۔ مگر فرض کر لیجئے کہ کسی نے سرے پلنگ کا پایہ اوٹھا کے نہیں دیکھا۔ رسوا۔ ممکن ہے۔

کسی طرح سے ہوسکیں شوق کبیرا شک

ملین گے آج ہم اوں سے قریب بل کے

انوار کے دن آٹھ بجے صبح کو بیگم صاحبہ بیہری فیض اور کہاڑے کے سر پرست اول ہو گئی۔ میں ابھی سو کے اٹھی تھی۔ اچھی طرح غصہ بھی نہ پہنے پائی تھی کہ اوسنے جلدی چھانا شروع کر دی۔ میں سمجھی تھی۔ کھانا دانا کھا کے جانا ہو گا۔ بہری نے کہا۔ بیگم صاحبہ نے اپنے تھر کی سہم دی ہے کہ کھانا ہمیں آ کے کھانا۔ میں نے پوچھا تو اب صاحب گھر پہن

اوسے کہا۔ نہیں۔ صبح سے اودھ کے گاؤں کو مدھالے ہیں۔ میں نے پوچھا کنبک
آئیں گے۔ مہری نے کہا۔ اب آئیں نوشام کو کہیں آئیں۔ مجھے بیگم سے نکلنے میں
بہت سی باتیں کرنا تھیں اس لیے فوراً اودھ بیٹھی۔ ہاتھ نہ دھو۔ کنگھی چوٹی کر کپڑے
پہن۔ ایک اما کو ساتھ لے کے روانہ ہو گئی۔

ماسکے جو دیکھا بیگم صاحبہ منتظر بیٹھی ہیں۔ میرے جانے کے ساتھ ہی دسترخوان بچا۔
میں نے اور بیگم صاحبہ نے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھایا۔ بہت کھلے کا کھانا تھا۔
پراٹھے۔ نور۔ کئی طرح کا سالن۔ بالائی۔ مہین چاولوں کا خشک۔ وزن چٹنی
سبب کا مرہ۔ طوا سوہن۔

کھانا کھانے چھکے سے میرے کان میں۔

بیگم۔ یوں وہ کریم کے گھر کی ادھر کی دال اور جوار کی روٹیاں بھی با دین۔

میں۔ چپ بھی رہو۔ کہیں کوئی سن نہ لے۔

بیگم۔ سن لے گا تو کیا ہو گا۔ کیا کوئی جانتا نہیں۔ نواب کی ماں (خدا جنت نصیب
کرتے) نے مجھے نواب کے لیے مول لیا تھا۔

میں۔ برائے خدا چپ ہو رہو۔ کہیں علیحدہ چلو تو بائیں ہو گئی۔

کھانا کھا کے ہاتھ نہ دھو یا۔ پان کھایا۔ مہری نے حقد لاسے لگا یا۔ بیگم نے سکو
بہانے سے مال دیا۔

میں۔ بارے تھے مجھے پہچان لیا۔

بیگم۔ جب تھیں پہلے پہل کا پور میں دیکھا تھا۔ اسی دن پہچان لیا تھا۔ پہلے تو
بڑی دیر تک اور پھر سی ہی تھی۔ دل میں کہتی تھی۔ میں نے انھیں کہیں دیکھا
ہے۔ مگر کہاں دیکھا ہے۔ کوئی نہ دیکھا ہے۔ یہ کچھ یاد نہیں آتا تھا۔ چاروں طرف خیال
دوڑاتی تھی کچھ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا اتنے میں کریم مہری پر نظر جا پڑی۔ کریم کے
نام پر مجھے موندی کاٹے کریم کا نام یاد آ گیا۔ دل نے کہا۔ اوہ ہو۔ انھیں کریم کے
کھان پر دیکھا تھا۔

میں۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ بڑی دیر تک فور کیا کی میری ساتھ دایوں میں ایک
خورشید ہے۔ او کی صورت تم سے بہت ملتی ہے۔ جب میں خورشید کو دیکھتی تھی۔

تم یاد آ جاتی تھیں۔

بیگم۔ اب میرا مال سنو۔

میں جب تم سے جدا ہو کے نواب صاحب کی ماں نواب عمدۃ النساء بیگم صاحبہ کے ہاتھ
بکی ہوں۔ تھیں یاد ہو گا یہ پور میں کوئی بارہ برس کا ہو گا۔ نواب کو سولہ ان برس غیا
نواب کے آبا جان کا پور میں رہتے تھے۔ بیگم صاحبہ سے اون سے نا اتفاقی رہتی تھی۔
نواب صاحب کے آبا جان نے نواب کی شادی اپنی بہن کی رکی کے ساتھ ٹھہرائی تھی۔
اوپر کا مکان دی میں تھا۔ بیگم صاحبہ کو وہاں شادی کرنا منظور نہ تھا۔ وہ یہ چاہتی تھیں
کہ نواب کی شادی اون کے بھائی کی لڑکی کے ساتھ ہو۔ میان یوی میں پہلے ہی سے
نا اتفاقی تھی۔ اس بات سے اور ضد بن کر تھیں۔ ابھی یہ بھگڑاٹے نہ ہوا تھا کہ نواب
کے دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ یکم میں نے تجویز کیا کہ بہت جلد شادی کر دینا چاہیے
ورنہ خون ہو جائے گا۔ شادی ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس نے میں میں پھوٹ گئی۔ بیگم صاحبہ
نے مجھے خرید لیا۔

نواب صاحب چچر مائل ہو گئے۔ اور ایسے مائل ہوئے کہ دونوں جگہ کی شادی سے کچھ کھانا
اکار کر دیا۔ غور سے دونوں کے بدن کا کرنا اسیا ہوتا ہے کہ بیگم صاحبہ نے انتقال کیا اور ان کا
چند ہی سال کے بعد بڑے نواب بھی مر گئے۔ ماں باپ دونوں صاحب جا مراد تھے اور
بھی ایک اکھوٹے لڑکے تھے۔ مکمل دولت انھیں کو ملی۔

نواب کو خدا سلامت رکھے چکی بدولت میں بیگم صاحبہ بنی ہوئی ہوں اور میں کرتی
ہوں۔ نواب مجھے اسی طرح چاہتے ہیں جیسے کوئی اپنے سہرے جلوسے کی بوری کو چٹا
ہو۔ میری ظاہر میں تو کبھی کسی طرف نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ یوں اپنے باہر دوست
آشناؤں میں جو کچھ چاہتے ہوں کرتے ہوں۔ آخر مر دوات ہیں کچھ میں اون کے مجھے
بچھے تو پھر ہی نہیں۔

خدا نے سب آرزو میں میری پوری کین اولاد کی ہوس تھی۔ خدا کے صدقے سے اولاد
بھی ہے۔ اب اگر آرزو ہے تو یہ آرزو ہے کہ خدا بین کو پورا ان جڑھائے۔ ہو یا وہ لاؤں اور
ایک پوتا کھلاؤں۔ پھر چاہے جڑھائوں۔ نواب کے ہاتھوں میں غریب ہو جائے۔ اب تم اپنا مال
جب رزم دی۔ بائیں کر رہی تھی مجھے اپنی قسمت پراسوسا نا تھا۔ اور دل ہی دل میں

کپڑے کیچڑ میں لت پت - تھوڑی دیر پانی میں جا کے کھڑے ہو گئے پھر ویسی
صاف - جن کے خراج میں کسی قدر احتیاط تھی - جیسے باجی بیگہ بان - وہ چھوڑ کر
جی میں بیٹھی رہیں -

بسم اللہ نے پہنچے جا کے منہ پر آرام کا رسل مل دیا۔ پھر اذکی تخمین اور سب
سواتیہ لکنا۔ دیکھئے کاترنا تھا۔

منہیں معلوم کہ ان سے کتنی باتیں تھیں انھیں۔ اور انکو گونا گونا شروع کیا۔
اور انکے ساتھ کابل کو لے کر والاعظم کی دھمکی بجاتا تھا۔ بھلا اور کھانا کھا کر چلے گا۔
گو کیا اچھا حاجم ہوتا۔ مگر اس موسم میں اور دوسری جگہ پہنچے ایسا نامناسب تھا۔
دو گھر مری دن رہے چاری قیمت سے آسمان کھل گیا۔ دھوپ نکل آئی۔
سہ لوگ احتیاطاً ایک ایک جہڑا گھر سے لیتے آئے تھے۔ سب نے پٹے بدلے۔
جنگل کی سرک کو نکلتے۔

میں بھی اسی طرح طرف کو روانہ ہوئی۔ سامنے گنجان درخت تھے۔ سورج آجین
 درختوں کی آڑ میں ڈوب رہا تھا۔ سہرے پر سنہری کرفوں کے پڑنے سے عجیبیت
 تھی۔ جا بجا جھگی ٹھوول کیلے ہوئے تھے۔ چڑیاں سہرے کی تلاش میں ادھار ادھر
 اور رہی تھیں۔ سامنے جمیل کے پانی پر آفتاب کی شعاع سے وہ عالم نظر آ رہا تھا
 جیسے چھلکا ہوا سونا تھا کہ رہا ہے۔ درختوں کے پتون کی آڑ میں سورج کی کرنیں اور
 اسی عالم دکھا رہی تھیں۔ آسمان پر سرخ شفق چھوٹی ہوئی تھی۔ اور وقت کا سنا
 ایسا تھا کہ ایک نفقائی مزاج عورت جیسی کہ میں ہوں۔ جلدی سے چھو لہاری میں
 چلی آتی۔ رہنماد دیکھتی ہوئی خدا جانے کتنی دیر تک گئی۔ آگے جا کر ایک نئی شکر
 ملی۔ اس سہرے کو گنوار راستہ چل رہے تھے۔ کسی کے کندھے پر لٹا تھا۔ کوئی بلیوں
 کو ہاتھ پیرا پلا جاتا تھا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی کھڑے۔ بھینسین لئے جاتی ہے۔
 ایک لڑکا بہت سی جھڑون بکروں کے پیچھے پیچھے تھا۔ یہ سب آنکھوں کے سامنے
 آئے۔ اور پھر نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں پھر اسی کی اسی ہی رہ گئی ہنسن
 معلوم کیں دشمن میں تھی۔ مگر اب اس شکر پر چلنے لگی۔ اپنے نزدیک میں اب
 گہانا لکھ کی طرف حل رہی ہوں۔ اب اندھیرا ہونا جاتا ہے۔ سورج ڈوبنے ہی

۱۷۱

ہے۔ اب میرے قدم جلد بلبلا دھڑ رہے ہیں۔ آگے چل کر ایک فقیر کا تکیہ ملا۔ یہاں پہنچ کر بڑے تھکے تھکے۔ یہاں میں نے تالاب کا راستہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ میں لکھنؤ کی طرف چلی جاتی ہوں۔ تالاب دہنے کو چھوڑ گیا ہے۔ یہاں سے ٹرک چھوڑنا پڑی ایک میٹر میں ہے ہو کے راستہ تھا۔ تھوڑی دُور جا کر ایک نالہ ملا۔ نالے کے اوس پار تھوڑے فاصلے پر دو تین درخت تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان درختوں کی طرف سے ایک ذرا ہٹ کر کوئی شخص سبلی سی دھوتی باندھے مرئی پہنے۔ ایک میلا سا جاوڑا کھڑے لیٹا ہوا کھڑی ہاتھ میں لیے کچھ کھوڑا ہے۔ میرے اس شخص کے چار کانٹھیں جو بن پہلے تو کچھ شبہ سا ہوا۔ پھر ایک مرتبہ فور سے دیکھا۔ اب قریب یقین کے ہو گیا کہ وہی ہے۔ چاہتی تھی کہ تہہ بھیر لوں۔ مگر کچھ کہتے اسی طرف لڑی رہی۔ اب تو بالکل یقین ہو گیا۔ قریب تھا کہ غش کھا کے گر پڑوں۔ اور ضرور ہی گر پڑتی۔ کہ اتنے میں دُور سے اکبر علی خان کے نوکر سلاخ کش کی آواز کان میں آئی۔ مجھے اُچھوٹے ہنسنے لگا تھا۔ مجھے آئے دیکھ دو لاہور خان نے لکھنؤ کی ہاتھ سے رکھی تھی جس طرح بن اوسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی جگہ دیکھ رہا تھا۔ مگر یقیناً اوسنے مجھے نہ پہچانا ہو گا۔ میں نے اُدھر اُٹھ کر طرح بیان کیا تھا۔

اچھی طرح پہچان لیا تھا۔
 سلا رنجش کی آواز سننے کے وہ نامے کی طرف بھاگا۔ اس نے بین سلا رنجش میرے پاس
 پہنچ گیا۔ میں مارے خوف کے قطر قطر کانپ رہی تھی۔ آواز سننے سے پہلے کھلی تھی
 جگہ کی بندھی ہوئی تھی۔ سلا رنجش نے میرا یہ حال دیکھ کے کہا۔ ہائے ڈرگن۔
 میں نے دھت کی طرف اشارہ کیا۔ سلا رنجش اور سطرٹ دیکھنے لگا۔
 سلا رنجش۔ وہاں کیا دھڑا ہے۔ اک کھڑی ٹری ہے۔ واہ۔ اس سے درمیان
 آپ سمجھیں کوئی تبر کو دور ہے۔ اور وہ گیا کہاں جو کھوڑا تھا۔
 میں۔ سنہ سے دو لڑا گیا۔ ہاتھ سے نامے کی طرف اشارہ کیا۔
 سلا رنجش۔ چلے بیٹے کیا ہو گا کبچے پر۔ آجھا تو چلیے خواب چھین صاحب بہت سی
 مرغیاں نکلا کر کے لائے ہن۔ آج کا کہیں تا نہیں۔ بیان ابو حروڑو ٹھنڈے گئے
 میں ادھر آ رہا۔ کہے آپ مل گئیں نہیں تو آپ کو راستہ نہ ملتا۔
 میں نے مان لیا۔ کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر سلا رنجش بھی چپ ہو رہا۔

تھوڑی دیر میں کھیتوں میں سے ہر کے نالاب پر چڑھ گئی۔

رات کو یہیں رہنے کی ٹھہری۔ جب کھانے دانے سے فراغت ہو گئی۔ میں نے اکبر علیخان سے کل واقعہ بیان کیا۔

اکبر علیخان نے اچھی طرح دیکھا۔ یہ وہی دلاور خان تھا۔ فیض آباد کا رہنے والا اور کچھ طویل جاری ہے۔ افسوس تھے پہلے سے نہ تھا۔ یہ معاش کو بل کے گرفتار کر کے بڑا نام بڑا سرکار سے انعام ملا۔ ایک ہزار کا کشتہ ہمارا ہے۔ اور یہ کھوٹا کیا تھا۔

میں۔ کیا معلوم۔ نوا ابھی قبر کھودتا ہو گا۔

اکبر علیخان۔ اس کے نام سے تھارے مندر پر وائٹان چھوٹے لگتی ہیں۔ اب وہ تھارا کیا کر سکتا ہے۔

میں۔ (دل کو زنا تمام کے)۔ ضرور اسے قدر کے زمانے میں وہاں کچھ گاڑ دیا ہو گا۔ اسے کھودنے آیا ہے۔

اکبر علیخان۔ چلو دیکھیں۔ میں۔ تو نہ جاؤ گی۔

اکبر علیخان۔ میں جانا ہوں۔ سلا بخش کو لے جاتا ہوں۔

میں۔ کہاں جاؤ گے۔ اب وہاں کچھ دھڑا ہو گا۔ وہ کھود کے لے بھی گیا ہو گا۔

اکبر علیخان۔ میں تو ضرور جاؤں گا۔

یہ ذرا زور سے کہا۔ پاس نواب محمد صاحب کی چھو لداری تھی۔ وہ اور بسم اللہ دونوں جاگ رہے تھے۔

نواب خاں صاحب کہاں جا رہے گا۔

اکبر علیخان۔ نواب صاحب آئے ابھی آرام نہیں کیا۔

نواب۔ جی نہیں۔ اکبر علیخان۔ میں حاضر ہوں۔

نواب۔ آئے۔

اکبر علیخان اور میں دونوں نواب کی چھو لداری میں گئے۔ کل واقعہ بیان کیا۔

نواب۔ (مجھے) اور میں اس بد معاش کو کیا جاؤ۔

میں۔ (اپنی سرگندہ زبان سے کیا کہتی)۔ میں جانتی ہوں۔ اچھی طرح جانتی ہوں۔

میں بھی فیض آباد کی رہنے والی ہوں۔

نواب۔ ۲۰ ماہ۔ آپ بھی فیض آباد کی ہیں۔

اکبر علیخان۔ مگر اس مردود کا کوئی بندوبست کرنا چاہیے۔ ایسے میں میں کہیں ہے۔ مجھ کہیں گرفتار ہو جائے یہ کہہ کے سلا بخش کو آواز دی۔ قلعہ ان لنگھایا۔

خانہ قریب تھا۔ خانہ دار صاحب کو رحمہ لکھا۔

تھوڑی دیر میں خانہ دار صاحب مع کس بارک سپاہیوں کے آمو جو ہوئے۔

میں نے جو دیکھا تھا اون سے کہہ دیا۔ گلاؤں سے پاسی بلوائے گئے پہلے اس موقع پر جا کر ڈھونڈھا۔ تکیہ پر فقیر سے کسی قدر سلخ اور ملا۔ ایک سپاہی کو ایک

اشرافی شاہی زلمے کی ملی۔ وہ خانہ دار صاحب کے پاس سے آیا۔

خانہ دار۔ خدا چاہے تو مع مال گرفتار ہو۔

خانہ دار صاحب نے واقعی آغا بندوبست کیا۔ سپاہیوں نے بھی خوب ہی تھک دو کی۔ آخر میں بجے رات کو کھانچ میں گرفتار ہوا۔ صبح ہوتے ہوئے خانہ دار پر چڑھ گیا۔

تلاشی میں جو میں شرفیان برآمد ہوں۔ میں شناخت کے لیے بلائی گئی۔

میری شناخت کے علاوہ دو سپاہیوں نے بھی پہچانا۔ دن بجے چالان لکھو کو روانہ ہوا۔

مرزا رسوا آگھا تو پھر اس کا حضور کیا ہوا۔ اس تھکے کو جلدی ختم کیجئے۔

اخراج ہو گیا۔ کوئی دو ہفتے کے بعد معلوم ہوا پچاسی ہو گئی۔ دھل چنم ہوا۔

نہ پوچھہ نامہ اعمال کی دلاؤ زری

تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا

مرزا رسوا صاحب اب اپنے میری سولہ عمری کا سو دہ چھ نظر نہائی کرنے کے بڑو دیا تھا۔ مجھے ایسا غصہ آنا کہ جی چاہتا تھا۔ ہر سے ہر سے کر کے چینگ۔ دن۔ بار بار

یہ خیال آتا تھا کہ زندگی میں کیا ہمو رو سپاہی ہوئی ہے کہ اس کا افسانہ بد مہنے کے بھی باقی رہے۔ کہ لوگ اسے پڑھیں۔ اور محکومت ملامت کیا کریں۔ مگر فرج کی

حاصلی اور آپ کی محنت کے لحاظ سے ہاتھ روک لیا۔

اتفاقاً کل شب کو بارہ بجے کے قریب سوئے سوئے آنکھ کھل گئی۔ میں جب معمول
کمرے میں نہ تھا تھی۔ اما میں۔ مذکورہ گارہ سب نیچے مکان میں سو رہے تھے۔ سرے سرے جانے
میں روشن تھا پہلے تو بڑی دیر تک کروٹیں مٹا کی۔ چاہتی تھی سو جاؤں کسی طرح
نہیں نہ آئی۔ آخر اٹھتی۔ پاؤں لگا کے کھایا۔ اما کو کچا رہا۔ حقہ بھر دیا۔ پھر ٹپک
پر جا بیٹھی۔ حقہ پینے لگی۔ جی میں آیا۔ کوئی تاب دیکھوں۔ بہت سے حقے۔ کہا نیکی
کن میں کمرے میں الماری میں رکھی تھیں۔ ایک ایک کو اٹھا اٹھا کے دین
اوتے پڑے۔ مگر وہ سب کئی کئی مرتبہ کی دیکھی ہوئی تھیں۔ جی نہ لگا۔ بند کر کے کھانا
آخر اوس سو رہے برا تھ جاڑا۔ خفقان کی خدمت تھی۔ سچ ج میں نے اس کے چاک
کرنے کا حکم قصہ کر لیا۔ چاک کیا ہی چاہتی تھی کہ یہ معلوم ہوا۔ جیسے کان میں کوئی
کہہ رہا ہے۔

آٹھا اٹھا۔ بالفرض اسے حقے چماڑ کے جینکدیا۔ جلا دیا۔ تو اس سے کیا ہوتا ہے۔
تمام حقے کے واقعات جو ضائع عادل و توانا کے حکم سے خوشنوں نے مفصل اور
مشریح لکھے ہیں ان میں کون سا سکتا ہے ؟

اس غیبی آواز سے میرے ہاتھ پاؤں لرزے لگے۔ قریب تھا کہ سو رہا تھا سے
گر پڑے۔ مگر پھر نے اپنے تئیں سمجھا لا۔ چاک کر ڈالنے کا خیال تو بالکل دل سے محو ہو گیا
تھا۔ جی جانا الماری پر جہاں سے اٹھا یا تھا۔ وہیں رکھ دوں۔ پھر کباری بول کہا
بلا قصد پر معاشہ شروع کیا۔ پہلا حقہ جب تم ہو گیا۔ دین اوٹا۔ دو چار سطرین اور
پڑھیں۔ اور وقت مجھے اپنی سرگذشت سے کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ میں
پڑھتی جاتی تھی جی چاہتا تھا اور پڑھوں۔ اور فقیروں کے پڑھنے میں مجھے ایسا
لطف کبھی نہ آیا تھا۔ کیونکہ انکو پڑھتے وقت یہ خیال پیش نظر رہتا تھا کہ یہ سب بنائی
ہوئی باتیں ہیں۔ درحقیقت کوئی اصل نہیں۔ یہی خیال مجھے کو بے مزہ کر دیتا تھا۔
میری سوانح عمری میں جو مورخ اپنے قلب کے کہے ہیں وہ سب بچہ گذرے ہیں۔ اور وقت
وہ بگڑ گیا میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ ہر واقعہ اصلی حالت میں نظر آتا تھا۔ اور
اس سے طرح طرح کے اثر میرے دل و دماغ پر طاری ہوتے تھے۔ چکا بیان بہت ہی
دخوار ہے۔ اگر کوئی مجھے اس حالت میں دیکھتا تو اوکو میری دیوانگی میں کوئی شک

دہتا۔ کبھی تو میں بے اختیار اس بڑنی تھی۔ کبھی ٹپ ٹپ۔ انکو گرنے لگتے تھے۔
غرض کہ جب کیفیت تھی۔ آپ نے فرمایا تھا۔ جا بجا بنانی جانا۔ یہاں اسکا ہوش کبھی
پڑھتے پڑھتے صبح ہو گئی۔ اب میں اٹھتی۔ وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ پھر ٹوٹی دیر ہوئی
صبح کو کوئی آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ ہاتھ منہ دھو کے پھر پڑھنے لگی۔ بارے سر نہام سارا
سو رہا پڑھ چکی۔

تمام حقے میں وہ تقریباً پ کی مجھے بہت ہی دلچسپ معلوم ہوئی۔ جہاں آپ نے
نیکیتوں اور خراب عورتوں کا مقابلہ کر کے اوکا فرن بتایا ہے۔ دامن نیکیت عورتوں
کو جس قدر فخر ہو رہا ہے۔ اور ہم ایسی بازار یوں کو اون کے اس فخر پر بہت ہی شک
کرنا چاہیے۔ مگر ساتھ اس کے یہ خیال آیا کہ اس باب میں بخت و اتفاق کو بھی بہت
کچھ دخل ہے۔ میری خرابی کا سبب وہی دلاور خان کی شہادت تھی۔ نہ وہ مجھے
اٹھا لاتا۔ اور نہ اتفاق سے میں خانم کے ہاتھ فروخت ہوئی۔ نہ میرا یہ لکھا پورا ہوتا
جن امور کی بڑائی میں اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا۔ اور اسی لیے ایک مدت
ہوئی کہ میں اون سے بیزار اور ناگوار ہوں۔ اوس زمانے میں اون کی حقیقت مجھے
کسی طرح نہیں معلوم ہو سکتی تھی۔ نہ ایسا کوئی قانون مجھے بتایا گیا تھا کہ میں اون سے
اجتناب کرنی۔ اور اگر ایسا نہ کرتی تو مجھے کسنا دیجاتی۔ میں خانم کو اپنا مالک
اور حاکم تصور کرتی تھی۔ اس لیے اون سے بہت ڈرتی تھی۔ اور حتی الامکان ایسا
کوئی کام نہ کرتی تھی جو اون کی مرضی کے خلاف ہو۔ اور اگر کرتی بھی تو بہت جھجکا کے۔
تاکہ اون کی مار اور جھڑپوں سے بچ سکوں۔ اگرچہ خانم نے مجھے زندگی بھر بھول کی
چھڑی بھی نہیں چھوئی۔ مگر خوف غالب تھا۔

جن لوگوں میں میں نے پرورش پائی تھی جو ادب کا طریقہ تھا۔ وہی میرا بھی تھا۔
میں نے اوس زمانے میں کبھی کسی مذہبی عقیدے پر غور نہیں کیا اور میرا خیال ہے کہ
کوئی ایسی حالت میں نہ کرنا۔

آدمی و سماوی حادثے جتنا کوئی وقت تقریر نہیں ہے۔ مگر جب واقع ہوتے
ہیں تو دل میں ایک خاص قسم کی دہشت سما جاتی ہے۔ مثلاً اور سے باول کا
گر جانا۔ بجلی کا جھٹکا۔ آندھ صیون کا آنا۔ آدھوں کا گرنا۔ یا زلزلے کا آنا۔ سب کچھ

یا چاند گہن۔ خط سالی۔ وبا۔ وغیرہ۔ ایسے امور اکثر خدای غضب کی علامت
سمجھی جاتی تھیں۔ پھر جیسے دیکھا کہ لوگوں کے بعض اعمال کی وجہ سے وہ منہ
دفع ہو گئی۔ مگر یہ بھی دیکھا کہ بہت سی آفتیں۔ و ما۔ تھوید۔ ٹٹنے۔ ٹٹکے۔
کسی بات سے نہ ٹٹیں۔ ایسے امور کو لوگ خدا کی مرضی۔ تقدیر اسمانی کی طرف
منسوب کر دیا کرتے ہیں۔ مذہبی احکام بجا و مفصل نہ چھوئے تھے۔ اور نہ ثواب و عذاب
کا مسئلہ اچھی طرح سمجھا گیا تھا۔ ایسے ان باتوں کا اثر میرے دل پر نہ تھا۔ بیشک
اوس نالے میں میری کوئی مذہب نہ تھا۔ صرف جو اور لوگوں کو کرتے دیکھتی تھی۔ وہی
آپ بھی کرتے لگتی تھی۔ اوس وقت میں میری کوئی مذہب ہی نہ تھا۔ تقدیر میں بہت
ہی شاکر تھی۔ جو کام میں کاہلی سے نہ کر سکتی۔ یا میری بے وقوفی سے بھڑکا جانا۔ اوس
تقدیر کے واسطے کروخی۔ فارسی کتابوں کے پڑھنے سے آسمان کی شکایت کرتے
کا مضمون میرے ہاتھ آ گیا تھا۔ اور جب میری کوئی مطلب فوت ہو جاتا تھا۔ یا اور کسی
وجہ سے مجھے کچھ ملال چھو جاتا تھا۔ تو جاو بجا فلک کی شکایتیں کیا کرتی تھی۔

ہم بھی ہیں مختار۔ لیکن اقتدر ہے اختیار

جب ہوئے مجبور قسمت کو بڑا کہنے لگے

مولو صاحب۔ بوا حسینی۔ اور بڑے بوڑھیاں جب اگلے زمانے کی باتیں کرتے
تھے تو اوس سے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ زمانے سے بہت ہی آگیا تھا۔ ایسے
ادبکی طرح میں بھی اوس زمانے کی غائبانہ تقریفات اور زائے موجودہ کی بلاوجہ
مذمت کیا کرتی تھی۔ میں کجست اس بات کو نہ سمجھی کہ بڑے۔ بوڑھیاں جو اگلے
وقتوں کی تقریفات کرتے ہیں اوس کا سبب یہ ہے کہ اپنی اپنی جوانی کے دن
سب کو بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے دنیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ خود زندہ۔
جہاں زندہ۔ خود مردہ۔ جہاں مردہ۔ سن رسیدہ لوگوں کے دیکھا دیکھی جوان
نے بھی اوجھیں کا وہ طرہ اختیار کر لیا ہے۔ اور چونکہ یہ غلط فہمی ایک مدت سے
چلی آتی ہے ایسے اب عموماً سب کو اس کی عادت سی ہو گئی ہے۔

جوان ہونے کے بعد میں عیش و آرام میں پڑ گئی تھی۔ اس زمانے میں گلابا کے
مردوں کو رہنا میرا خاص پیشہ تھا۔ کہیں بقاء بلوہد ساتھ دایوں کے جس قدر

کامیابی یا ناکامیابی بھگوانی تھی وہی میری خوشی یا رنج کا اندازہ تھا میری صورت نسبت
اور دن کے کچھ اچھی نہ تھی۔ مگر فن موسیقی کی بہارت اور شرومن کی قابلیت کی وجہ
میں سب سے بڑی جڑھی رہی۔ اپنی ہم پیشہ عورتوں میں مجھے ایک خاص مقام کا حیا
حاصل تھا۔ مگر اس سے کچھ نقصان بھی ہوا۔ وہ یہ کہ جس قدر میری عزت زیادہ ہوتی گئی
اور تنہا خیال خود داری کا میرے دل میں پیدا ہوتا گیا۔ جہاں اور دنیاویان میل کوں
اپنا مطلب نکال بیجاتی تھیں۔ میں نہ دیکھتی رہ جاتی تھی مثلاً اوس کا یہ ایک عام
قاعدہ تھا کہ ہر کس و ناکس سے کسی نہ کسی قسم کی فرمائش ضرور کر دینا چاہیے۔ مجھے اس سے
خرم آتی تھی۔ یہ خیال آتا تھا کہ ایسا ہونا کارگرد سے نفع بخش ہوگی۔ اور نہ ہر شخص سے میں
بہت جلد سے تکلف ہو جاتی تھی۔ میری اور ساتھ دایوں کے پاس جب کوئی اکے
بیٹھا تھا تو اوس کو سب سے زیادہ فکر اس کی ہوتی تھی کہ یہ کہاں تک دیکھتا ہے۔ اور ہر
کہان تک اس سے لے سکتے ہیں۔ میرا بہت سا وقت اوس شخص کی ذاتی لیاقت میں
اخلاق کے اندازہ کرنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ مانگنے کی عادت کو میں جو سب سمجھنے لگی تھی
ایکے علاوہ اور باتیں بھی مجھے میں زندگی سے کی نہ تھیں۔ ایسے میری ساتھ دایوں
میں سے کوئی مجھے ناک جوئی گرفتار۔ کوئی خفتانی۔ کوئی بے وقوف۔ کوئی دیوانی
سمجھتی تھی۔ مگر میں نے اپنی کی کسی کی نہ سی۔

پھر وہ زمانہ آیا کہ میں زندگی کے ذیل پیشہ کو عیب سمجھنے لگی۔ اور اوس سے دست بردار
ہو گئی۔ ہر کس و ناکس سے ملنا چھوڑ دیا۔ صرف نالچ۔ مجھے ہر سہراوقات رہی۔ یا کسی
دشمن سے ذکر رکھا تو فوری کر لی۔ رفتہ رفتہ یہ بھی ترک کر دیا۔

جب میں اولن اخال سے تائب ہوئی جبکہ میں نے اپنے نزدیک راسخ لیا تھا۔ تو کاش
برے جی میں آیا کہ کسی مرد آدمی کے گھر پڑ جاؤں۔ لیکن پھر یہ خیال آیا کہ لوگ کہیں گے۔
عزیز نڈی تھی نا۔ کن کا جو نکا کیا۔ مرزا صاحب شاہ باب اس محاورے کو نہ سمجھیں مطلب
ایسا ہے کہ جب کوئی زندگی میں سے اوس کے کسی کے گھر پڑ جاتی ہے تو تجربہ کار تائبین
اوس کی نسبت کہا کرتے ہیں کہ اوس زندگی نے کن کا جو نکا کیا۔ یا مرے مرے کن نے دی
بے اپنے دام بچائے اور ازراہ فریب تائبین پر اپنی تہنیر و تحفین کا مار ڈالا۔ اس طرح
انڈیوں کی بچہ خود غرضی۔ لالچ۔ اور فریب کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ
ہم لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ میں سچ تائب ہو گئی۔ اور اب اہنہا کی نیک
ان گرا اسکو سواے خدا کے کون جانتا ہے کسی شخص کو میری نیکی کا یقین نہیں ہو سکتا۔

پھر اگر اس حالت میں کسی سے محبت کروں اور اس محبت کی بنا پر غلوں اور تنکبانی پر ہوا کسی خاصہ شخص اور اسکے ہوا اور جو لوگ دیکھیں بائیں کے کبھی قبیلہ نہ لائیں گے پھر محبت کرنا بھی ہے وہ ہو گا۔ لوگ شہور کرنے ہیں کہ میرے پاس دولت ہے اس لیے اکثر لوگ اس میں میں بھی میری خواہش کرنے ہیں۔ اور میں طرح کے قریب جھک دینا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب میرے حسن و جمال کی فریفت کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ کافلوں میں ایسی زندگیوں سے سن چکی ہوں جو مجھے بہتر ہیں۔ کوئی صاحب میرے کمال کو یہ قبی پرش ہیں۔ حالانکہ ان کے کان نال سے سے آشنا نہیں۔ کوئی میری شاعری کے مدح میں جنھوں نے میرے ایک مصرعہ موزون کہنا تو کیا چاہا بھی ہو گا۔ ایک صاحب میری علیت کے قائل ہیں۔ خود بھی بڑے لکھے ہیں۔ مگر جھکو ہو نا بفضل اولیاء۔ سمجھتے ہیں۔ معمولی سے روزہ نماز کے بھی مجھے بے وقوف لیا کرتے ہیں۔ گویا کہ میرے مریدا مقلد ہیں۔ ایک میرے عاشق نازیری دولت اور کمال سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے عربت میری تدریجی کے خواہاں ہیں۔ ہر بات پر اسٹاک ہیں۔ مجھے چھینک آتی۔ اور ان کے دربار پر بے لگا۔ مجھے دربار اور اور ان کے دشمنوں کا دم نہ مل گیا۔ ایک بزرگ نزع شفق بنے ہیں۔ دنیا کے نسب و فزاں سمجھایا کرتے ہیں۔ جھکو بہت ہی بھولا سمجھتے ہیں۔ اس طرح بائیں کرتے ہیں جیسے کوئی دس گارہ برس کی لڑکی سے بائیں کرنا ہو۔

میں ایک کھاگ عورت ہوں۔ کھاٹ کھاٹ کا پانی پیئے ہوئے جس طرح بنانا ہے نیچائی ہوں اور حقیقت انکو بنائی ہوں۔ غلوں کے ساتھ مجھے ملنے والے دو ایک صاحب ہیں۔ بے غلظت ملتے ہیں۔ اور کھا مقصود صرف ایک ذراں خاص ہے۔ فلاغ و سخن۔ یا کانا۔ بجانا۔ یا صرف لطف گفتگو۔ اور بھی کوئی غرض مجھے ہے نہ مجھے کوئی غرض ان سے ہے۔ ایسے لوگوں کو میں دل سے چاہتی ہوں۔ اور یہ بے غرضی رفتہ رفتہ ایک غرض ہو گئی ہے کہ نہ مجھے خبر ان کے چین آتا ہے نہ انھیں خبر میرے۔ مگر ان لوگوں میں سے کوئی میرے گھر میں چلے گا میرا دل ان میں ہے۔ کاشکے ایسا ہوتا اگر یہ اتنا ہی ہے جیسے کوئی کہے کاشکے جوانی خیرتی ہے۔ امیں کوئی شک نہیں کہ عورت کی زندگی جوانی تک ہے۔ اگر جوانی کے ساتھ ہی زندگی بھی ختم ہو جایا کرتی تو کیا خوب ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ ہوں تو یہاں یا ہر ایک کے لیے بڑا ہے۔ خصوصاً خور کے لیے۔ خصوصاً زندگی کے لیے۔ زندگیوں کے لیے بڑا ہوا درج کا تونہ ہے بڑا صاحب غیر نیاں و گھنٹے گلی کو جو میں بڑی جھرتی ہیں۔ اگر غور کیجئے گا تو انہیں اکثر زندیاں نکلیں گی۔ اور زندیاں بھی کوئی جو بھی زمین پر پاؤں رکھتی تھیں۔ نیامت برہان رکھی تھی۔ ہزاروں خبر پڑے گھر بنا کر دیے سیکڑوں جوانوں کو بے گناہ قتل کیا۔ جہاں جاتی تھیں لوگ انھیں چھا

تھے۔ اب کوئی انکی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا پہلے جہاں چھ بانیاں تھیں رگ۔ باغ ہو جاتے تھے اب کوئی کھڑے ہوئے کجا بھی روادار نہیں۔ پہلے بن گئے مونی ملنے تھے اب گئے جھیک نہیں ملتی۔

انہیں سے اکثر اپنے ماحول اپنی تباہی کا باعث ہوئے۔ ایک بڑی بی میرے مکان پر کبھی کبھی آیا کرتی تھیں۔ کسی زمانے میں بڑی شہور زندگیوں میں تھیں۔ جوانی میں ہزاروں روپے کھاتے۔ زراعت پر مایوس تھا۔ جب سن سے اتریں وہی کمائی یاروں کو کھانا شہر کو کی بڑا چاہے میں ایک نوجوان کے گھر میں۔ اسکی جو روح و صورت کم سن۔ بھلا وہ اب کس کا رکھتا۔ پہلے تو بڑی ذرا بگڑا ہوں۔ مگر جب میان نے اصل طلب سمجھا دیا۔ خاموش ہو رہی۔ انکی غلط فہمی ہو گئیں۔ جینک مال رہا۔ خوب دونوں بیان پر یوں نے پھٹا پھٹا کے کہا۔ آخر کھڑے ہوئے۔ اب کون پوچھتا تھا۔ کمال باہر کیا۔ گلوں کی عورتیں کھا تی ہیں۔

بعض بے وقوف زندگیوں نے کسی کی رکھی کے بالادوں سے دل لگا کر اس حماقت میں میں بھی گرفتار ہو چکی ہوں۔ مگر جب وہ جوان ہوئی دے دے کسی کے ساتھ چل گئی۔ یا اگر بڑی توکل مال رفتہ رفتہ اپنے قبضے میں کیا۔ انکو کھانا نظام یا اگر کر کے رکھ لیا۔

آبادی نے بھی نقل دیا ہونا مگر وہ تو کھوا دے کے کہ تو تپسی کی کل کے نہیں زندگی کے جاتی۔ مرد کیا اور عورت کیا۔ زندگی کی قوم میں یہ کاروں کی انکی کا اصول ہی ایسا لگا ہوا کہ ایک دوسرے میں محبت نہیں ہو سکتی۔ نہ کوئی کھجور دردی انکو دل دیکھتا ہے۔ نہ کونکب جانتے ہیں کہ زندگی کسی کی نہیں ہوتی۔ اور عورت ہی ایسی محبت کر سکتی ہے۔ وہاں اپنے دل میں یہ سمجھتی ہیں کہ جاتے ہیں پھر انکو یوں دین۔

اکھلے قدر دان مردوں میں کے بعد گناہ کرتے ہیں۔ اسکی عادی ہوتی ہیں کہ لوگ جھوٹی خوشامدی کیا کریں۔ بھلا۔ اب کوئی خوشامدیوں کو نہ کہتا۔ غرور مردان سے گناہ کھس اور یہ مردوں کی شاکی رہتی ہیں۔

پہلے پہلے میں بھی اور زندگیوں کی زبانیں مردوں کی بے وفائی کا دکھائے سننے دنت ضائع کرتی تھی اور بے سمجھے انکی زبان میں غلامی تھی۔ مگر باوجود اسکے کہ گھر مرزا نے میرے ساتھ جو کچھ ملو لکھا وہ آپ کو معلوم ہے۔ اور ذرا بصاحب جنھوں نے پھر نکاح کا الزام لگایا تھا اسکو بھی آپ سن چکے ہیں۔ میں مردوں کو بے وفائیاں نہیں کر سکتی۔ اس معاملے میں عورتیں خصوصاً بھارتی و الیائی ان سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ محبت کے باب میں مرد (مساں کیجئے گا) اکثر بے وقوف اور عورتیں بہت ہی چالاک ہوتی ہیں۔ اکثر مرد بچے دل سے اظہار عشق کرتے ہیں۔ اور اکثر عورتیں جھوٹی محبت

جاتی ہیں۔ ۱۔ سلیے کہ مرد جس حالت میں اظہارِ عشق کرتے ہیں دو حالت اونکی ضروری ہوتی ہے اور خود میں بہت جلد متاثر نہیں ہوتے۔ کیونکہ مرد بہت ہی جلد عورتوں کے حسنِ ظاہر پر فریفتہ ہو کر ادب کا شہیدا ہو جاتا ہے۔ اور عورتیں اس باب میں زیادہ احتیاط کرتی ہیں۔ اسی لیے مردوں کی محبت کسی قدر سرچہ ازالہ سے اور عورتوں کی محبت عیبِ الزوال۔ مگر جانشین کے حسنِ معاشرت سے ان امور میں ایک خاص قسم کا اعتدال پیدا ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ دونوں باکمال کم ایک کو سمجھ پڑے۔ راستی مرد اس باب میں کسرِ سراج الاقتدار ہوتے ہیں۔ اور عورتیں انہماکی سے مرد پر عورت کا جادو بہت جلد بھل جاتا ہے۔ مگر عورت بڑبھل کامل شکل سے کارگر ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہ نقصِ فطرت کی طرف سے ہے۔ ۱۔ سلیے کہ عورتیں ضعیفِ لقویٰ ہیں۔ اس لیے اونکو بعض صفت ایسے دیئے گئے ہیں جس سے یہ کی پوری ہو جلتے۔ بخدا ان اوصاف کے ایک نمونہ یہ ہے۔ بلکہ میں کہہ سکتی ہوں شاید یہی ایک صفت ہے۔ اسکی مثال جانوروں میں بھی مل سکتی ہے۔ اکثر ضعیف جانوروں میں بھی جیسے کہ گری کا مادہ ہے۔

اکثر مرد یہ کہیں گے کہ عورتیں جین ہوتی ہیں۔ میں اسکی تائید نہیں۔ درحقیقت نہ مرد ہی بجائے خود حسین ہے۔ نہ عورت۔ بلکہ ہر ایک کو ایسا حسنِ عنایت ہوا ہے جو دوسرے کو اچھا معلوم ہو۔ یوں خود مرد عورت جب کا ناگ۔ نقشہ اچھا ہوتا ہے۔ سب اسے پسند کرتے ہیں۔ مگر اصل قدر ان مرد کے حسن کی عورت اور عورت کے حسن کا مرد ہے۔ ایک خوبصورت عورت دوسری عورت کے سامنے اس خوش رنگ پھول سے زیادہ نہیں ہے جیسے خوشبو نہیں۔ اور ایک عورت مرد بھی خوبصورت ہی خوبصورت عورت کی رائے میں خوشبو دار پھول کی طرح دل پسند ہے۔ اگرچہ اسکی شکل اور رنگت میں کوئی ندرت نہ ہو۔ محبت کے باب میں غلطی نہ ہو۔ ایک ہی طرف سے نہیں ہوتی بلکہ دونوں اس پار کی کو نہیں سمجھتے۔ ان دونوں نمونوں کی اچلتی میں فرق ہے جس کا گاہ سے مرد عورتوں کو دیکھتے ہیں اس کا گاہ سے عورت مرد کو دیکھتی ہے۔ عورتوں کی محبت کرنے کا اندازہ ان مردوں میں نایک حد تک پایا جاتا ہے جو کسی مالدار عورت کے دامنِ دولت سے وابستہ ہے۔ یا جس کا حسن بہت کم ہے۔ مگر کوئی حسنِ کسیدہ عورت اونکو کرین چلتے گی۔

آسمین شک نہیں کہ عورتیں جوان مرد سے نسبت بڑھوں کے زیادہ محبت نہتی ہیں۔ مگر ایک وجہ بھی محض حسنِ جمال نہیں ہے۔ بلکہ وجہ یہ ہے کہ عورت ضعیفِ القویٰ ہے۔ اس لیے وہ ہر حالت میں اپنے حیا کی کو بہت دوست رکھتی ہے تاکہ وقتِ حرورت اسکو خطرے سے بچا سکے پس جوان کی نسبت بڑھ کے اسکی زیادہ توقع ہو سکتی ہے۔ اور جس جمال اس غری کے ساتھ مل کر اس کے وصف کو رونق دیرینا ہے۔

تخلیص یہ ہے کہ مرد کی محبت میں صرف لذتِ چل کرنا مقصود ہے۔ اور عورت کی محبت میں اہم سے محفوظ رہنا اور لذتِ چل کرنا دو فوٹن خالص میں۔ چونکہ یہ شہود ہے کہ محبت میں غرور ہونا چاہیے۔ اور عورت کی محبت میں اس کا زیادہ لگاؤ ہے۔ لہذا وہ ایک چھپنے کی کوشش کرتی ہے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ جو امور میں اس موقع پر جان کے ہیں ان میں سے اکثر باتوں کا شکار نہ مردوں کو ہوتا ہے۔ عورتوں کو۔ تو میں اس سے تسلیم کر دوں گی۔ اور یہ کہ کوئی کہے کہ باتیں اہلِ فطرت سے مرد عورتوں کے خیر میں داخل ہیں۔ کچھ مرد نہیں کہے کہ ان عورتیں اسکا شوق بھی ہو۔ میں نے عمر بھر کے تجربے کے بعد یا مرد دریافت کیے ہیں۔ اور میرے ساتھ جو شخص یہ خبر دے گا وہ اسے سمجھ سکتا ہے۔

میں دیکھتی ہوں کہ اکثر عورتیں اور ناخاندہ مرد بھی ایسی باتوں پر غور نہیں کرتے۔ اس لیے انکو اپنے زمانہ زندگی میں بہت سی بیک بیک جھجک جھجک کرنا پڑتی ہے۔ میرے خیال میں مرد اور عورت دونوں اپنے اپنے رتے اور اسے راض کو سمجھ لیں۔ تو ان میں ہرگز کمال نہ ہو۔ بہت سی آفتیں مل جائیں اور بہت سی دشمنیں دور ہو جائیں۔

مگر ایک فصل ہے کہ جب کسی کو کسی بات کی تھرا لیں گے تو اسکی جواب ملے گا۔ جو اوہ جی اور فقیرین ہوں گا۔ ہر سہے گا۔ اسکا یہ طلب ہے کہ ہم جو چاہیں کریں۔ ہمیں ضرور کہہ سہارے کیے کہ نہیں ہونا۔ اپنے ہماری یہ کاروں کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ جو کچھ ہو گا تھیرے ہو گا۔ مینی جو کچھ کھیلے گا وہ ناخاندہ کی طرف سے ہو گا۔ یہ تو کھیلو کھیلے زلمے میں کسی قدر با مینی ملی تھی۔ کیونکہ اس زلمے میں اتفاقات سے گھڑی جھرس کچھ کا کچھ ہو جاتا کرتا تھا۔ اس پر کچھ شاہی دماغ کی ایک نقل یاد آتی ہے۔

زمانہ شاہی میں انقلاب کا ثروت اکثر تار ہوتا۔ تو گون کی حالتوں میں دنیا تفتہ ہو جایا کرتا ایک دن کا ذکر ہے۔ ایک سپاہی نہایت ہی محنت سے حال ہوتی محل کے چھانگے کے پاس جوڑے بڑا سرور مانتا تھا۔ فضلے کا شمار صبح کے بعد بادشاہ ٹپلتے ہوئے اور صبح مل آئے۔ اتفاقاً اس وقت کوئی ساتھ تھا۔ نہیں معلوم کیا جی میں آیا۔ آپ نے اسے سمجھا دیا۔ وہ سپاہی پر نہیں بند سے آگہیں ملتا ہوا دھنسا۔ جہاں پناہ پر گاہ پڑی۔ پہلے تو گھبرا گیا۔ مگر پھر ایک ہی مرتبہ اپنے اپنی حالت کو سمجھ گیا۔ فوراً تلوار اُتر کر۔ بادشاہ نے نذر قبول کر لی۔ رنگ آلودہ تلوار اُتر کر میان سے برفت نکلی۔ پھر دیکھ بھال کر اس تلوار کی جو صفت کی اور میان میں کر کے اپنی کمر میں لگائی۔ خود جو دلائی پناہ سے ہوئے جسے جھکا ملائی قبضہ تھا۔ کمر صبح اسکو حوالہ کی۔ اسی موقع پر حضور عالم (خطاب علی نقی خان دہلادہ) آگئے۔ جہاں پناہ نے اس کو جلا اور اسکی تلوار کی تعریف کی۔

بادشاہ۔ دیکھنا بھی کیا بھلا جوان ہے۔ اور تلوار بھی ایسے پاس کیا ہی عمدہ تھی۔ (رک کر سے تلوار کھنکھول کے) یہ دیکھو۔
وزیر۔ جلد عالم بھان اشد اگر حضور بنا جو ہر شناس اور قدردان بھی تو ہو۔ جب لیے رگ اور بی حسرت و کستاب ہوئی ہیں۔
بادشاہ۔ مگر دیکھنا بھی۔ میری تلوار بھی کچھ ایسی بزرگ نہیں ہے۔
وزیر۔ نقل بکائی کی تلوار اور بزرگ۔
بادشاہ۔ مگر اس اس کے مناسب نہیں ہے۔

اس اثنا میں اور صاحب۔ ملازم شاہی۔ چوبدار۔ خاص بردار آگئے۔ اچھا خاصہ مجمع ہو گیا۔ وزیر۔ دست ارشاد ہوا۔
بادشاہ۔ اچھا مبارک کپڑے تو ایسے بھانکے دیکھے جائیں۔ اس اشارے کے پاتے ہی لوگ دوڑے۔ لباس کی کٹھنیاں انھوں نے اٹھ آئیں۔ بادشاہ نے لمبوس خاص جو اہم وقت پہننے کو ہے۔ مع مالے مردارید اور جوڑی نورتن مرصع کاراوسے خایت کی۔ آپ اور کپڑے زیب تن کیے۔ جب وہ کپڑے پہن چکا۔
بادشاہ۔ مان اب دیکھو۔ وزیر۔ داعی صورت ہی ادر ہو گئی۔

اور مصائب اور مختار بھی خرمین کے گئے۔ بادشاہ تھری ویرہاں ٹھہرے۔ اب سواری آگئی تھی۔ سواری کے ہوا کھانے چلے گئے۔ سپاہی خوشی خوشی گھر آیا۔ جو بری۔ بہا جن۔ دلال۔ گویا ساتھ ہی گئے ہوئے تھے۔ اسباب آگیا کیا۔ سب پاس ساتھ ہزار و پیر کی مالیت تھی۔ سپاہی کا حال سنے۔ کہیں بھینوں کی پٹن میں تین روپیہ کا کام تھا۔ رات کو کھڑن کھانے کو بری سے نکار ہوئی۔ آپ غماہ کے گھر سے کل گئے رات بھر خدا جلے کہاں کہاں ملے مارے مھرے۔ صبح ہوتے توئی محل کے پاس غم کے چوڑے گئے۔ نیند رگنی۔ صبح کو طالع بیدار سے بنگایا۔
تو کہ غم نہ نظر آیا۔ دم بھر میں محتاج سے شہی کر دیا۔

اس طرح کے واقعے شاہی میں اکثر ہوا کرتے تھے۔ ادا ایسے ہی زلمے میں ایک ہزار ملکیں تھیں۔ جبکہ خان حکومت ایک شخص کے ماتھ میں ہو۔ اور وہ کسی فاعل سے اور قانون کا پابند نہ ہو۔ ملک کو اپنی ملک۔ اور خزانے کو اپنا مال سمجھے۔

اگر بی قیادری میں ان مضمول ہرجون کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کی بے لسانی بھی جاتی ہے کہ کسی شخص کو باوجود ملاستحقان ایک رقم غیر ویرہاں ہے۔ ایسی سلطنت جس میں بادشاہ سے لیکر خزانے تک ایک قانون کے پابند نہ ہوں۔ اگر خزانہ کا لحاظ رکھا جائے تو ہرگز کام نہ ملے۔ اس زمانے میں خدیر کا نہ زمین چلتا۔ جو کچھ ہونا ہے تو ہر سے ہونا ہے۔

نواب چھٹن صاحب کا حال سنیں (اٹھائے سولہ غری میں ایک باقیہ ذکر فرمادے گا) ہر گویا تھا۔ درحقیقت آپ دیار پر ڈوبنے گئے تھے۔ اس ارادے سے غوطہ کھایا کیا بے اہم ہو گئے۔ مگر جان بہت پیاری چیز ہوئی ہے۔ جب دیر تک پانی کے نیچے رہے وہ مگر نہ لگا۔ جی میں آیا ابھی اور بھر کے پھر سانس لے لیں۔ او بھرے۔ پانی کی سطح پر آکر دیکھا تھا۔ پاؤں چلنے لگے۔ پھر مرنے کوئی جا۔ پھر غوطہ ادا۔ پھر وہی حال ہوا۔ وہی طرح کی غوطے لگائے مگر ڈوبنے دین نہ پڑا۔ آخر اسی کوشش میں پہنچے پہلے چتر منزل تک پہنچ گئے۔ اٹھنا اور وقت ہزاروں حمد بہادر (ارجم) مع اپنے چند مصاحبوں کے بھرے پر سواری ہو کر سر کو کھلے تھے۔ اونچی نظر جو پڑی۔ سمجھے کوئی شخص خواب رہا ہے۔ ملاوٹ کو مکر دیا۔ جلدی کمال انھوں نے اپنے چتر کے لیے بہت کوشش کی۔ وہ لوگ سمجھے تھے گھبرا گئے ہیں۔ آخر ہر دوستی کی رائے پر لائے۔ ہزاروں حمد نے اپنے لئے غلب کیا۔ احوال برسی کے بعد معلوم ہوا بیس زادے میں کپڑے رحمت کیے۔ اپنے ہمراہ کو بھی میں نے پہنے گئے۔ چھٹن صاحب ایک خوشنود جوان۔ دوسرے ادب فاعل سے واقف۔ علم مجلس سے آگاہ۔ کسی قدر غنا بھی تھے طبیعت میں نہان بھی تھا۔ غرض کہ ہر طرح شاہزادے کی صحبت کے لائق تھے۔ فوراً مصاحبوں میں اسم ہو گیا۔ پیش قرار شاہزادہ مقرر ہوا۔ اخراجات ہندی کے لیے کچھ ہر پیش میں مل گیا۔ ذکر۔ چاکر۔ سواری سب سرکار سے رحمت ہوا۔ لیجے پھر کیا تھا۔ پہلے سے زیادہ مٹا خد ہر کے اب جو جو کہ نین نکلے فوجوں ہی اور تھا۔ ماضی پر سواری ہیں۔ پچاس خاص بردار آگئے دور سے چلے جاتے ہیں۔ جسم اندر سے اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پہلے نو عین نہ آبا۔ کہیں میان خد دم بخش بھی دیکھے۔ سمجھے چلے آتے تھے۔ اور نکو اشارے سے بلا پایا۔ مفصل حال معلوم ہوا۔ ایسے بعد چھانے بھی میل کر دیا۔ شادی بھی ہو گئی۔

شادی میں ہم لوگ بھی بلائے گئے تھے۔ خاتم کو بہت عمدہ دو شاہ بردار دیا گیا اور دل سے کبھی ہمارے مکان پر آئے۔ درہم لکھ سے رقم رکھا۔ خاتم اور پال ملی تھیں۔ مگر نہ بڑی اونچی ہو گئی۔

خلاصہ ہر شاہی میں اس طرح کے کٹھے اکثر نظر آ جاتے تھے۔ جہاں اگر بی حکومت بن یہ کہاں۔ وہ دن گئے نیل خان خانانہ اور ایک۔ سننے چلے آئے ہیں کہ دولت اندھی ہے مگر اب ایسا معلوم ہونا ہے کہ کسی حکومت سے اونچی انھیں کھول دی گئی ہیں۔ اب اونکو لائے اور نالائقی کا خیال ہو گیا ہے۔ شاہی عیال داری میں جاہل ناخاندانہ جو اہلعت کے نام سے جانے جاتے تھے۔ بڑے بڑے عہدہ و ن پر فائز تھے۔ میں اپنی برون اون سے ہم کو نہ کہتا ہوں کہ

اور موعود خواجہ سر اٹھان کے پاس بیٹھیں اور سامنے تھے۔ بھلا انصاف کیجیے نہیں آئے کی بات ہے یا نہیں۔

غور کہ تقدیر کی سلطنت کا دور دورہ گیا اور تیرہویں کا عہد حکومت آیا۔ اب جو ہر ذاتی ہو چکا تھا اب اور جو ہر ذاتی کی دولت و شہرت ہے۔ آپ وہ کہ گھر بڑے لائق خالق ہوں۔ مگر جب آپ کو کوئی جانتا ہی نہیں تو تیرہویں کی ہو۔

تقدیر اور تیرہویں کے مسلمان میں بہت دن چکر میں رہی آخر معلوم ہوا کہ جن منون میں لوگ ایک لفظ کو استعمال کر رہے ہیں وہ بالکل دھوکا ہے۔ اگر اس سے یہ مراد ہے کہ خدا کو ہر ذی سب باقون کا علم ازل سے ہے تو ہمیں کچھ شک نہیں۔ وہ کافر ہے جبکہ اس کا اعتقاد نہ ہو۔ مگر لوگ تو مہم انداز اپنے تمام افعال ناشائستہ کے بڑے نتائج کو تقدیر کی طرف نسبت دیا کرتے ہیں۔ اس سے خدا کی قدرت پر الزام آتا ہے۔ یہ بالکل کفر ہے۔

افسوس! جن باقون کو میں اب بھی۔ اگر پہلے ہی سے کچھ لگتی ہوتی۔ تو بہت اچھا ہوتا۔ مگر نہ کوئی سمجھتا ہے نہ دانتا تھا۔ اور نہ خود اسنا تجربہ تھا کہ آپ ہی کچھ لیتی۔ سو لویا جینے جو در حرف بڑھا دیے تھے وہ میرے بہت کام آئے۔ (خدا اوکے درجات عالی بڑی اوس زمانے میں مجھے اسکی قدرت نہ تھی۔ تن آسانی اور آرام طلبی کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ علاوہ اسکے تدریجاً ان اسقدر تھکے کسی وقت فرصت بھی نہ ملتی تھی۔ جب وہ دن آئے کہ تدریجاً ان ایک ایک کر کے کھینکے گئے تو مجھے ذرا اہمیت ملی۔ اس زمانے میں کتب مینی کا شوق بڑھا کیونکہ سراسر اسکے اب کوئی اور شغل نہ رہا تھا۔

میں کچھ کہتی ہوں کہ اگر یہ شوق ہوتا تو اب تک میں زندہ نہ رہتی۔ جو اتنی کے ماتم اور اگلے قدر داون کے غم میں کب کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ کچھ دن تو میں نے کھانی کی کتابوں سے دل بہلاتی رہی۔ ایک دن پرانی کتاب میں دھوپ دینے کے لیے نکالیں اور میں وہ گلستان بھی نکلی جو مولوی صاحب سے بڑھی تھی۔ اور ہر دو دھوپ سے دن اول ہلٹ کے پڑنے لگی۔ پہلے مجھے اس کتاب سے نفرت ہی ہو گئی تھی۔ ایک تو اسلئے کہ قیام کا

ابتدائی زمانہ تھا۔ عبادت مشکل معلوم ہوتی تھی۔ دوسرے تجربہ نہ تھا۔ اسلئے کچھ مجھ میں لگتی تھی۔ اب جو بڑھا۔ ذرا دقتیں اور ہونکی تھیں۔ خوب ہی دل لگا کے میں نے سرے سے آخر تک کئی مرتبہ بڑھا۔ غورہ فقرہ دل میں اتر جاتا تھا۔ اسکے بعد ایک صاحب سے اخلاق نامی کی قرین کتاب کے اسکے پڑھنے کا شوق ہوا۔ اور میں نے ایک نسخہ لکھا کہ بڑھنا شروع کی۔ دانی اس کتاب کے مطالب بھی شکل ہیں۔ اور عربی مقلین کثرت سے

میں اسلئے اس کے سمجھنے میں بہت دقت ہوئی۔ مگر تھوڑا تھوڑا پڑھ چکے بہت دنوں میں کتاب کو ختم کیا۔ پھر دانشنامہ غیاث منصور زول کشور کے مطلع میں چھپا۔ اسے پڑھا۔ پھر ایک مرتبہ صغریٰ۔ کبریٰ کو بجائے خود مطالعہ کیا۔ اور جو نہ سمجھ میں آیا اسے پوچھ لیا۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے دنیا کے ہر تجربہ کھلتے جاتے ہیں۔ ہر بات کی سمجھ آگئی۔ اس کے بعد میں نے بہت سی کتابیں اس قسم کی اردو کتابیں بجائے خود پڑھیں۔ اس سے طبیعت کو جلا ہوتی گئی۔ تھامدا لوزی۔ و خاقانی جیسے جیسے پڑھے۔ مگر جمہوری خوشامد کی باقون میں اب میرا دل نہ لگتا تھا۔ اسلئے اوکے بڑے کر کے الماری میں رکھ دیا۔ نئی الحال کئی اخبار بھی میرے پاس آتے ہیں۔ اور میں نے پڑھا کرتی ہوں۔ ان سے دنیا بھر کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے۔ کفایت خساری کی درجہ سے میرے پاس اب بھی اسقدر اندر خدمت ضرور ہے کہ اپنی زندگی بسر کو لکھا دیتی۔ دنیا کا مالک اللہ ہے۔ میں بہت دن ہوئے کچھ دل سے دیکر چکی ہوں۔ اور حتی الوسع روزہ نماز کی بھی پابند ہوں۔ یہی زندگی کی طرح ہوں۔ کیونکہ خدا جہاں اسے چاہے جلائے مجھے بردے میں گھٹ گھٹ کے تو نہ بیٹھا جائے گا۔ مگر پردہ دایوں کی دل سے دعا گو ہوں۔ خدا کا راج سہاگ قائم رکھے۔ اور رہتی دنیا تک اوکا پردہ رہے۔ اس موقع پر میں اپنی ہم پیشہ عورتوں کی طرف مخاطب ہو کے ایک نصیحت کرتی ہوں۔ چاہیے کہ اپنے دل پر نقش کر لیں۔

”ای بے وقوف زندگی کسی اس جلا دے پر نہ آنا کہ کوئی جھکوتے دل سے چاہیگا۔ تیرا آتش نا جو مدت غیر جان دینا ہے چاروں کے بعد چلنا پھرنا نظر آئے گا۔ وہ پیچھے ہرگز نہ رہیں کہ سگنا۔ اور نہ تو اس لائق ہے۔ سچی جاہت کا فراویا نیکی کا حق ہے جو ایک کا شہد دیکھ کے دوسرے کا شہد بھی نہیں دیکھتی۔ تجھ ایسی بانواری محض کہ یہ نعمت خدا نہیں دے سکتا۔“

خیر میری توصیہ گذشتہ نامی گذر گئی۔ اب میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔ جسے دن دنیا کی ہوا کھانا ہے۔ کھاتی ہوں۔ میں نے اپنے دل کو بڑھ بکھا دیا ہے کہ میری کل آرزوین پوری ہو چکیں۔ اب کسی بات کی تمنا نہیں رہی۔ اگرچہ یہ آرزو بخت وہ بلا ہے کہ مرے دم تک دل سے نہیں نکلتی۔

مجھے امید ہے کہ میری سوانح عمری سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہو گا۔ اب میں اپنی تقریر کو اس خیر پر ختم کرتی ہوں۔ اور سب سے امیدوار دعا ہوں۔

مرنے کے دن تریب ہیں شاید کہ اوجات
تجئے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی

تمت بالغیر

دخواست بنام

ورما برادر س

معرفت ہادیو پرشاد

امین آباد

لکھنؤ

تصنیفات محمد علی انصاری دہلوی

جعفر عباسی - دنیا کی بیوفائی زمانہ کے
انقلابات - حیرت رنج غم - بس دل بکڑ بچا گیا
بالکل بے چین کر دینے والے سامان - یانا دل
کے پر اے میں قوم کو نیک صلاح - قیمت ہر
عجرت - عشق و محبت کی پرورد حکایت حسن
و عشق کے کرشمے - معشوق کی اقرب ادائیں
عشاق کی بیباکیاں - تو کیا کوئی قصہ یہ نہیں
بالکل علمی یا حشہ - دیکھئے - قیمت - ہر
اختر و حبیہ بہت ہی دلچسپ پرانہ ناول
قیمت عیار

نیل کا بی - کلیو پیر اور انسانی حسرت
بہری داستان بالکل تاریخی واقعہ قیمت - ہر
مسیحا کی عالم بقصد صحت کی مستند کتاب - ۸

تصنیفات محمد علی انصاری دہلوی

حسن انجیلنا - بیہ وہ ناول پر حسین ترکوں سے
دہلیوں کی لڑائی اور بایرانوں کا جوش اسلام
سے تہ کوئی کی مدد کو آنا اور ویسٹ کو متواتر لکھ
نیکر انجنتوحات ماصل کرنا - اور پر اے انیون اور
ترکوں کا بھی بیسی نادر قیمت - ہر
درگیش شہنشاہی یہ شہنشاہی کی جو تریا تمام
زمانہ میں عجیب چاچر - نہایت ہی عجیب اور
دلکش ہے قیمت - ہر بدر الغسانی مصیبت
شہید وفا - ہر منہ خور و مومنا سنان
محمد دغلازی کا جوش اسلام - قیمت - ہر

دلکش - ۱۳ - دلچسپ - ۱۴

دلگداز شہ - ہر شہ - ہر
زیادہ حلاوت کامل قیمت ہر
ملک العزیز و جتا - صلیبی زبان ہر
مولفہ حالی جناب مرزا محمد ہادی

صاحب - بی - اے

طلمس اسرار - یہ ایک ڈراما میں سامین
حکیم افلاطون کا مصر کے طلمس میں داخل ہونا -

وہاں کے عجائبات کا دیکھنا - مذکورہ مکالمات
کرنا - طرح طرح کی ترفناں اور آرائشوں میں پڑ کر
نکل آنا - خوبصورت سحر کار عورتوں سے ملنا - اکی

زریب - افلاطون کی بر سر گاری - اوس مقام میں
پہنچنا جہاں افلاطون محرم اسرار کیا جاتا ہے -
مرزا سراسر سے اوسک اطلاع دیکھا جاتا ہے - قیمت

مطابو تاج - اس میں قیمت ڈراما کا ایک لفظ
حکمت اور فلسفہ سے بہرہ ہوا ہے - عبارت الہی
سلیس ہے جسے ہر ایک شخص سمجھ سکے - کوئی سامین

ایسا نہیں جسکو دیکھنے اور غور کرنے سے کوئی غی
بات نہ معلوم ہوئی ہو یا کوئی نصیحت - قیمتی ہوا ایک
مصنف مزاج اس ڈراما کا مسودہ دیکھ کر کیا اپنی

داؤدی تھی - اگر مرزا ہوتے تو اس قسم کی تصنیف
بھی ایک صدی تک ہندوستانی زبان میں نہ آتی
قیمت فی جلد صرف ۳

المسلم - شہ - ہر
ورما برادر س - امین آباد - لکھنؤ

ورماز سنون دندان -

مسور ہون میں سردی سے درم ہونا مسور ہون سے
گوشت اور جانا - مسور اور مسور ہون کا قفسن -
زردی - سیاہی سیلابین دور کرنا - مسور ہون دار
کرنا - مسور ہون کو قوت بخشنا - خون گرنا بند کرنا
اور سے ہونے گوشت کو از سر نو جانا - دانت
چکیلے کرنا - جڑوں سے کیڑی نکالنا وغیرہ
ان باتوں کے لیے نفع دہی قیمت - ۱۰ - ۱۰ - ۱۰
دیکھئے مفت دیکھئے -

مثنوی امید و نینم - اس مثنوی کے دو حصہ ہیں
پہلے میں مصنف نے عشق و جوانی کی حالت کا
ایک نہایت ہی خوش اور دلچسپ سینہ دکھایا
ہے گویا یہ اعلیٰ شاعری کا ایک نمونہ ہے -
دوسرے حصے میں سراسر حکمت اور معرفت پوری
ہوئی ہے - اس میں عالم کی ایک تصویر کشی ہے
دیکھائی گئی ہے - حکمت جدید کے اکثر مسائل
مع استدلال نہایت فصاحت و بلاغت سے بیان
کئے ہیں - پھر انسان کی حالت پر ایک نظر کی جو
اور انسان کے دماغ میں جو جو قوتیں ہیں اور
اونکا جو جو کام ہو اونکو نہایت ہی خوبی سے عام
فہم اشعار کے ذریعہ سے بیان کیا ہے - پھر امید
نیم کی کیفیت ایک خواب کے پیرایہ میں بیان
کی ہے جو کہ نہایت ہی دلچسپ ہے قیمت - ۲۰ -

پندت رتن نامہ صاحب

کاشی - ایک دلربا ناول - عورتوں کی چہل

پہل بھو لیون کی چہل چہل چہل چہل چہل چہل
ہے - کاشی کی زندگی کل بھو لیون کے لیے
دستور العمل کا حکم رکھتی ہے - حسن میں نایاب
عصمت میں انتخاب - قیمت - ۱۰ - ۱۰ - ۱۰
ہشو - با مذاق ناول قیمت - ۱۰ - ۱۰ - ۱۰
کرشم و حکم - ناول کیا ظرافت اور اخلاق کا
مجموعہ ہے قیمت - ۱۰ - ۱۰ - ۱۰
بی کمان - برونک اور رام کی تصویر کشی ہے
بہترین مثنوی ہوئی دوہین - بالکل فرخ ناول کو
ڈھنگ - قیمت - ۱۰ - ۱۰ - ۱۰
نساء آزاد کامل سے کوہسار - ۱۰ -
بہام سرشار - عہد خدائی فوجدار - عہد
بنگالی ناول کے ترنمے

اندرا - یہ بنگالی قیامت کا نثر اور حد سے زیادہ
دلچسپ ہے بنگالی زبان میں تو اس قدر مقبول ہو چکا
ہے کہ جس نسخے سے ترجمہ کیا گیا ہے وہ آٹھواں اور تین
تھا - بنگالہ کے بابیکم چندر چٹرجی اس ناول کے
مصنف ہیں - قیمت - ۱۰ - ۱۰ - ۱۰
رادھارانی - حد سے زیادہ دلچسپ ناول ہے - سر
پاربتی - ایک نہایت دلچسپ اور خوش ناول - ۱۰ -
جنون انتظار - ایفے نساء کے تراشوا - مصنف
امرا کرمان آدا - جو صاحب امر اور جان کو پر حسین
وہ جہانی کر کے اسے ضرور دیکھیں - اس میں بھی
نالہ رسوا ایسی قیامت کی ہے کہ پروا لا فرد و داد دیکھا
قیمت بکچر بہن صرت - ۱۰ - ۱۰ - ۱۰
درما رادرس - امین آباد - کلکتہ

ہندہ میں دن تک میں گڑھی میں رہی۔ غور شدہ سے دروازہ ملتی تھی۔ غور شدہ کا دل و دان لگا ہوا تھا۔ میرا جی بہت گھبراتا تھا۔ آخر راجہ صاحب سے بیٹے عرض کیا۔ میں۔ حضور نے مجھے حکم دیا ہے۔

راجہ۔ ہاں۔ تو چھپرہ کیا جانا چاہتی ہو۔

میں۔ جی ہاں۔ پھر لڑائی کو فرصت پہنچے۔ پھر حاضر ہو جاؤں گی۔

راجہ۔ یہ تو لکھنؤا خضرے ہن۔ اچھا کہاں جاؤ گی۔

میں۔ کا پور۔ راجہ۔ لکھنؤ نہ جاؤ گی۔

میں۔ حضور۔ لکھنؤ کیا منہ لے کے جاؤں گی۔ خانم سے کیسی شرمندگی ہو گی ساتھ الٹا کیا کیا نہیں گی۔

اول تو میرا ارادہ لکھنؤ جانے کا نہ تھا۔ دوسرے یہ بھی خیال تھا کہ لکھنؤ جانے کو راجہ سے کہو بھی تو شاید روٹا نہ ہو گی۔ کیونکہ وہاں جانے سے غور شدہ کا حال کچھ نہ

شاید خانم کوئی آفت برپا کر میں۔

راجہ صاحب میرے اس ارادے سے بہت خوش ہوئے۔

راجہ۔ تو لکھنؤ کبھی نہ جاؤ گی۔

میں۔ لکھنؤ میں میرا کون بچا ہے۔ گمانے بجائے کا پینہ ہے۔ جہاں رہو گی۔

کوئی نہ کوئی قدر دان نکل ہی آئے گا۔ خانم کی قید میں رہنا اب مجھے منظور نہیں۔

اگر وہاں رہنا ہوتا تو کھل کیوں آتی۔

میں نے راجہ صاحب کو بالکل یقین دلادیا کہ میں لکھنؤ ہرگز نہ جاؤں گی۔

دوسرے دن راجہ نے مجھے جمعیت کیا۔ دل شرفیان (اندام) دے۔ ایک نسا

دیا۔ ایک رومال۔ ایک رتھ۔ مع بن بن۔ غرض کہ مجھے ڈیرہ وار ہتھ بٹا دیا۔

ایک گاڑی بان اور دو آدمی میرے ساتھ کیے۔ ادنا ڈکروانہ ہوئی۔ وہاں پہنچکر

سلاو لکھنؤا میرے کھان میں ٹھہری۔ راجہ صاحب کے آدمیوں کو جمعیت کیا۔

صرف گاڑی بان رہ گیا۔ ہر شام میں اپنی کھڑی کے سامنے بیٹھی ہوں۔ سدا کرتے

باتے ہیں۔ مجھیا ریان جلا رہی ہیں۔ میان سا فرادھرا دھرا۔ کھان جھانڈا ہوا

قد پانی کو آدم۔ کھانے پینے کو آدم۔ کھوڑے ٹھوسے لیے نیم کا سایہ...

اتنے میں کبھی کیا ہوں فیض علی کا سائیس چلا آتا ہے۔ سراسرے چانگ ہی سے اوکی کچا

چوڑی۔ میرے اوکی جا آکھیں ہو میں۔ وہ سید صاحب سے پاس چلا آتا۔ بائیں کرنے

پہلے برا حال ہوتا اور کچے جدمین سے فیض علی کو پوچھا۔ اوکے کھانا ڈکروانہ کی غذا

میں آنے کی خبر مل گئی ہے۔ آج رات کو ہر ڈیرہ ہر رات کے کھوڑے کو جانیں گے۔

یہ سن کے مردوں و خواتین کے۔ وجہ یہی کہ مجھے اب فیض علی کا ساتھ منظور نہ تھا۔ سخت کھوڑے

کے واسطے کے جدمین بھی تھی اب کھانہ خلاصی ہو گئی۔ ادنا زمین فیض علی کے لئے کا

سان گان تک نہ تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ (پھر کھانا سا سا ہوا۔ دیکھ لیا ہوا ہوا۔

فیض علی سری جان نہ چوڑے گئے۔ رات کو کوئی ڈیرہ ہر رات کے فیض علی جان بڑاں

ہو گئے۔ سولی بات جیت کے ہوا ادنا سے روٹا کھانا مشورہ ہوتے گا۔ بڑی در تک

بائیں زمین۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ گاڑی بان کو جمعیت کرو۔ سائیس گاڑی بٹکا لے گا۔

میں خود کھوڑے کو کچھ لون گا۔ پھر ٹھہری کہ گاڑی سلاو دھنڈاری کے پاس چوڑو۔

راٹن رات لگاکا اسکا بار اوڑھو۔ اب میں کیا کر سکتی تھی فیض علی کے بس میں تھی۔ جو

ادھون سے کہا مجھے چارو ناچار منظور کرنا پڑا۔ فیض علی نے سلاو کو بلایا کھانا سے لپکا

یہ تک بائیں کین۔ کوئی آدمی رات کے کھانے ساتھ کھوڑے پر مجھے بٹھایا۔ سراسرے

باہر ہوئے۔ پانی چھ کس زمین کا چلنا۔ رات کا وقت میرا بند بند ٹوٹ گیا۔ مدقن دو

رہا۔ آخر جون فون کر کے لکھنے کے کھانے سے چھوٹے۔ بڑی مشکل سے ناؤ تلاش کی۔ اسکا بار

اوترے۔ فیض علی سے کہا۔ اب کوئی خوف نہیں ہے میرے ہوتے کا پورہ چھوٹے

فیض علی سے بھولا تھی حال کی سوائیں ادنا خود کھان کی تلاش میں نکلی تھی

دیر کے بعد کے کہا۔ یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے۔ کھان بنے ٹھہر لیا ہے۔ وہاں چلی

چلو۔ ڈولی کر لیا کی۔

ٹھوڑی دیر میں ڈولی ایک بختہ عالی شان کھان کے دروازے پر ٹھہری فیض علی

سے ملکر یہاں ادنا مارا۔ کھان کے اندر جا کے کیا دیکھتی ہوں کہ ایک دالان میں دو ٹھہری

ہاں ہاں بیان بڑی ہیں۔ ایک چٹائی بھی ہوئی ہے۔ اوپر ایک عجیب طع کا تھ لکھا ہوا

ہے۔ جسے دیکھتے ہی تھپے سے مجھے فرت ہوئی۔ کھان کا قرنہ دیکھ کے دل کو ڈھس

ہونے لگی۔ ٹھوڑی دیر کے بعد فیض علی نے کہا۔ اچھا تو میں ہمارے کچے کھانے کو لے